انشاء اللہ

آزاد ہند تا ابد رہے



مولانا ابوالکلام آزاد

مصنف

اوتار کرشن گنجو

بھارتی سحر گاندربلی



انشاءاللہ

آزاد ہند تا ابد رہے



جناب مولانا ابوالکلام آزاد
مہاتما گاندھی کے پیروکار اور مجاہدین آزادی

میں یہ کتاب
جناب مولانا ابوالکلام آزاد صاحب
کے نام منسوب کرتا ہوں جو کہ آزاد ہند کے پہلے وزیر تعلیم رہے۔



تاثرات

تنقیدی اُردو کتاب ''انشاء اللہ آزاد ہند تا ابد رہے'' جس کے منصف اوتار کرشن گنجو بھارتی سحر گاندربلی ہیں، میری نظر سے گذری۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح سے تنقید نگار نے آزاد ہند کے پہلے وزیر تعلیم جناب ابوالکلام آزاد صاحب کے چند خطوط اور دوسرے کئی اہم ادیبوں کی تخلیقات کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ جس سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ مصنف نے تنقید نگاری کے ذریعے کس طرح سے اس امر کو روشن کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا آزاد صاحب نے کیسے انگریزی سامراج کے خلاف آواز بُلند کرتے ہوئے اپنے خطوط کے ذریعے آزادی کی جدوجہد اپنے دوستوں تک پہنچائی۔ تنقید نگار نے آزادی کی تحریک کے دوران ہوئے کئی اہم واقعات کا تذکرہ بھی اس کتاب میں کیا ہے۔

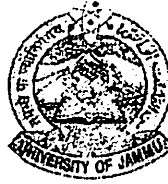
ایک صحت مند تنقید ادب میں نکھار لانے کا کام کرتی ہے اور اس حوالے سے

مصنّف نے ایک اچھی کوشش کی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مصنّف کے خیالات سے ہر کوئی متفق ہو۔لیکن مجھے امید ہے کہ اُن کی طرف سے لکھی گئی یہ کتاب اُردو ادب کے بیش بہا خزانے میں ایک اور اضافہ کرے گی اور نوجوان مصنّفوں کو تنقید نگاری کی طرف راغب کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ مصنّف اُردو ادب کے فروغ کیلئے اپنی کاوشیں جاری رکھیں گے اور مستقبل میں اُن کی مزید تخلیقات منظر عام پر آئیں گی۔

این این ووہرہ
گورنر
جموں و کشمیر

Dr. Shohab Inayat Malik
(Gold Medalist)
Head & Professor, Department of Urdu,
Director, Professional Studies in Urdu
University of Jammu- 180 006
Ph.No. 0191-2458306(o)
0191-2520287(R)
Mob. 94191-81351, 96975074266
Dated ____________





ISO 9001-2000 Certified

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اوتار کرشن گنجو سحر گاندر بلی کی نئی کتاب ''انشاء اللہ آزاد ہند تا ابد رہے'' شائع ہو کر منظر عام پر آنے جا رہی ہے۔ اس کتاب سے پہلے بھی مصنف کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جو ادبی حلقوں میں توقیر کی نظر سے دیکھی گئیں۔

زیر بحث کتاب کے مضامین کا میں نے مطالعہ کیا۔ بعض اہم افسانہ نگاروں کے افسانوں پر مصنف نے بڑی خوبصورتی سے بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ اوتار کرشن گنجو سحر گاندر بلی نے مولانا ابوالکلام آزاد کے بعض اہم خطوط پر بھی بحث کی ہے۔ منشی پریم چند کے مختلف تہہ خانے مضمون میں مصنف نے نہ صرف یہ کہ اُن کے بعض اہم افسانوں کو شائع کیا ہے بلکہ ان افسانوں پر اپنی رائے زنی بھی دی ہے۔ کرشن چندر اُردو ادب، احمد شاہ پطرس بخاری کے خطوط، مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت رتن ناتھ سرشار کی کہانی بھی معلوماتی مضامین ہیں۔ تمام مضامین سادگی، سلاست اور روانی سے لکھے گئے ہیں۔ سلیس اور سادہ زبان اس مجموعہ کے ہر صفحہ پر دکھائی دیتی ہے۔

میں اوتار کرشن گنجو سحر گاندر بلی کو یہ کتاب شائع کرنے کیلئے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعاء کرتا ہوں کہ انکی یہ کتاب بھی ادبی حلقوں میں مقبول ہو۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ

پروفیسر شہاب عنایت ملک
صدر شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی

مکتوب

میں یہ آٹھویں کتاب اردو کے افسانوں کے بارے میں بطور تنقید شائع کر رہا ہوں۔ اس میں کئی افسانہ نگاروں کے متعدد افسانے تحریر کئے گئے ہیں جو کہ مختلف کتابوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ اُن کتابوں کا عمیق مطالعہ کر کے میں نے ان پر تنقید لکھی جو کہ اس کتاب میں شائع کر رہا ہوں۔ اب محققین حضرات پر منحصر ہے کہ وہ میری تنقید پر کیا رائے پیش کرتے ہیں۔ فی الحال میں نے اپنی قلم سے اظہار خیال کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش صحیح رہی یا نہیں اسکا فیصلہ تو محققین حضرات پر ہی منحصر ہے۔ میں نے متعدد افسانہ نگاروں کی تحریر کردہ کتابوں کا بغور مطالعہ کیا لیکن مجھے جناب مولانا ابوالکلام آزاد کے کتاب ''غبارے خاطر'' بہت ہی دلچسپ لگی۔ جس کو پڑھ کر مجھے یہ معلوم ہوا کہ جناب مولانا ابوالکلام آزاد بہت ہی وسیع نظر رکھنے والے ادیب شمار کئے گئے ہیں۔ جناب مولانا ابوالکلام صاحب کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو دوقومی نظریہ کبھی تصور نہیں کرنا چاہیئے۔ دوقومی نظریہ کو کبھی بھی دل میں جگہ نہیں دینی چاہیئے۔ مجھے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے خطوط پڑھ کر یہ معلوم ہوا ہے کہ ساہتہ اکیڈمی نے ان خطوط کو سلیس انداز میں نہیں چھپوایا تا کہ عام آدمی کو خطوط کا

تصور سمجھ میں آسکے۔ خیر میں نے ادبی انداز سے اپنے تاثرات ان خطوط کے بارے میں قلم بند کیئے ہیں۔ تمام خطوط پر نہیں بلکہ محض دو تین خطوط پر ہی اکتفا کیا ہے۔ مجھے جناب مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کے خطوط بہت ہی دلچسپ لگے تو میں نے مناسب سمجھا کیوں نہ یہ تصنیف انہی کے نام منسوب کروں۔ مولانا کو ہندوستان کے مجاہدین آزادی میں ایک اعلیٰ مقام حاصل تھا اور وہ آزاد ہند کے پہلے وزیر تعلیم کے منصب پر فائز تھے۔ اردو ادب کے تمام ادباء انکو احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

میں ریاست جموں و کشمیر کے گورنر صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کیئے۔ اس ضمن میں جناب این این ووہرا صاحب کے عوامی صلاح کار کا خط صفحہ نمبر ۱۰ پر چھپا ہے تا کہ پڑھنے والوں کو گورنر صاحب کے تاثرات پر شک وشبہ کے گنجائش نہ رہے۔

نیز صدر شعبہ اُردو جموں یونیورسٹی کے جناب پروفیسر شہاب عنایت ملک صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کے بارے میں اپنے ادبی تاثرات قلمبند کیئے۔

میں نے اس کتاب کا عنوان بھی مولانا کے خطوط سے متاثر ہو کر تجویز کیا ہے۔ میں نے یہ مناسب سمجھا کیوں نہ اس کتاب کا عنوان تحریکِ ہند کے مجاہد کے نام منسوب کروں۔ اسی کے ساتھ میں ان الفاظ کے ساتھ ''انشاء اللہ آزاد ہند تا ابد رہے'' اس تنقیدی کتاب کی تخلیق و اشاعت کر رہا ہوں۔

01/02/2012

اوتار کرشن گنجو
بھارتی سحر گاندربلی

Governor's Secretariat
Raj Bhavan
JAMMU

Shri Avtar Krishan Ganjoo Bharti Sehar Ganderbali,
Government Quarter No. 2, Roller Shed,
B. C. Road, Jammu.

Sub: Foreword of HEG the Governor, J&K State, for publication in the book titled "Inshallah Azad Hind Ta Abad Rahay".

I am directed to enclose herewith a copy of Foreword approved by HEG the Governor, for publication in the book, titled "Inshallah Azad Hind Ta Abad Rahay", as requested by you.

22/12/2011

(Thakur Singh)
PRO
Governor's Secretariat
Raj Bhavan
Jammu

Dated: 22-12-2011

فہرست مضامین

اُردوزبان اور قاعدہ نثر

1947 سے پہلے ہمارے ملک میں اُردو کا رُجحان بہت ہی بلند پایہ رہا۔ اُردو کی مقبولیت اسی لئے خاص رہی کیونکہ اِس زبان سے ہمیں شاعری کے فن ملتے ہیں۔ شاعری کا ہی نہیں بلکہ نثر کا ایک بہت ہی بڑ ذخیرہ اُردوزبان میں پایا جاتا ہے، لیکن 1947ء کے بعد اُردوزبان کا رُجحان علاقائی زبانوں کی ترقی کے سبب ملک میں کم رہا اوراسی لئے اُردوزبان ارتقائی منزل سے گرتی چلی گئی۔

خیر اگر ہم اِس زبان کے نثر پڑھیں گے تو ہمیں اس بات کا پورا احساس ہوجائے گا کہ آزادی کی جدوجہد کے دوران اُردو اخباروں نے آزادی کے لئے ایک اہم رول ادا کیا۔ بہت سے صحافیوں نے اُردوزبان میں ایسے ایسے مقالے اپنے اپنے اخباروں میں چھاپے جن سے لوگوں میں آزادی حاصل کرنے کا ولولہ جوش مارنے لگا۔ اگرچہ ہم اُس دور کے صحافیوں کی تحریروں پر بحث ومباحثہ کریں گے تو ہمیں اس بات کا احساس ہوجائیگا کہ انہی کی ہی تحریروں سے تحریک آزادی کا پرچم لہرایا گیا۔

ہم اُردوزبان کے نئے نثر نگاروں اورافسانہ نگاروں کی تحریروں پر بحث ومباحثہ

کرتے ہوئے پرانے نثر نگاروں اور افسانہ نگاروں کو بھولا نہیں سکتے۔ ان کے لکھے ہوئے نسخے اور کتابیں تا ابد اس زبان میں موجود رہیں گے۔

اب ہم اُردو زبان کے افسانہ نگاروں، ڈرامہ نگاروں، نثر نگاروں کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے اس امر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اُردو زبان میں آج تک نثر، افسانہ اور ڈرامہ کو تقسیم نہیں کیا گیا۔

اردو زبان میں افسانہ نگاروں نے بہت سے افسانے لکھے لیکن اُن کو مختلف شاخوں میں تقسیم نہیں کیا گیا۔ جیسے کہ صحافی افسانہ، سماجی افسانہ، انقلابی افسانہ، سیاسی افسانہ وغیرہ وغیرہ اسی طرح سے ڈرامہ نگاروں اور دیگر نثر نگاروں کے رُجحانات کو ہم نے تقسیم نہیں کیا۔ اس سے ہمیں اِس بات کا احساس ہوجائے گا کہ کن کن ادیبوں نے مختلف طرز پر اپنی تحقیق بطور افسانہ، نثر اور دیگر موضوعات پر اپنی تحقیقی تحریریں لکھی ہیں اُن کو تقسیم نامے میں نہیں لکھا گیا۔ جس سے کہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس طرز کے افسانے، ڈرامے اور دیگر موضوعات پر قلمی نسخے موجود ہیں۔

اگر ہم سیاسی افسانے پڑھنا چاہیں تو اِن کو روزمرہ کے اخباروں میں پڑھ سکتے ہیں۔ کیا محقق مصنف سے اس سوال کا جواب طلب کرسکتا ہے کہ سیاسی طرز کا افسانہ میں نے کیوں بیان کیا ہے؟ افسانہ نگار لوگوں سے متعلق مسائل اور سیاسی و سماجی موضوعات ڈرامائی اور افسانوی انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اب محققین یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ ان کو افسانہ یا ڈرامہ کے طرز پر نہیں لکھ سکتے۔ اگر ہم ان موضوعات کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں اِس بات کا پورا احساس ہوجائے گا کہ صحافیوں نے افسانے کے طرز پر مختلف کرداروں کو اپنے اپنے اخباروں میں لکھ کر چھپوائے ہیں تا کہ کسی کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا نہ ہو۔ کیوں نہ ہم ایسے طرز کی تحریر کو سیاسی افسانہ ہی کہیں۔

اُردو زبان کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ کسی بھی غیر زبان میں ایسی تحریر اور ایسا

لہجہ موجود نہیں ہے جیسا کہ اُردو زبان میں، لیکن لوگوں کی مشکلات کے متعلق سبھی زبانوں میں تحریر و لہجہ یکساں ہے۔ لوگوں میں اردو زبان سے غفلت ہونے کے وجہ سے اس کا ہم صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے کیونکہ آج کل غیر ملکی اور علاقائی زبانوں کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی لئے اُردو زبان میں اس قسم کی مشکلات پائی جاتی ہیں۔ لیکن اُردو زبان کا نثر ہمیشہ سے غیر زبانوں کے مدمقابل بہت ہی بہترین ثابت ہوا ہے۔
ہم انگریزی زبان کے اخباروں کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُردو زبان کا لہجہ ہی لوگوں کی مشکلات کو سمجھنے کے لئے سہل ہے۔ یعنی اُردو زبان ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے روزمرہ کی مشکلات کا حل سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اردو زبان میں نثر کا ذخیرہ موجود ہونے کی وجہ سے اِس زبان وسعت حاصل ہے۔ اس زبان میں نثر، افسانے اور ڈرامہ نویسوں کی کثیر تعداد موجود ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو صحافت سے انقلاب کیسے آیا؟

یہ بات صحیح ہے کہ اُردو اخباروں سے ہی لوگوں میں بیداری پیدا ہوئی۔ ہم اس کی تحقیق اپنی ریاست جموں و کشمیر کے موضوع پر کرتے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں عوامی جمہوریت سے پہلے ڈوگرے بادشاہوں کا راج لوگوں پر رہا، لیکن ان دنوں ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان اردو زبان رہی جو کہ آج تک چلتی آرہی ہے۔ اُردو زبان میں ہی ریاست جموں و کشمیر کے مختلف اخبارات چھپتے رہے۔ 1931ء کے دوران ریاست میں مختلف اخبار اپنی اخباری تجارت کرتے رہے۔

ا۔ مارتنڈ

یہ اخبار ریاست جموں و کشمیر میں بہت ہی مشہور اخبار تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ اخبار کشمیری پنڈتوں کے دلائل پیش کرتا رہا۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہند کے

وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اس اخبار کو پڑھنے کیلئے بہت ہی پریشان رہتے تھے۔ وہ یہ اخبار کسی نہ کسی طریقے سے سرکاری اور غیر سرکاری طریقے سے حاصل کر کے پڑھتے تھے۔ اس اخبار میں افسانوی طرز پر دلائل چھپتے رہے۔ ان دنوں اِس اخبار میں مشہور دانشور اپنا اپنا طرز بیان چھپواتے رہے۔ مثلاً اس اخبار میں پنڈت کشپ بندو، پنڈت شیو نارائن فوطیدار اور پنڈت جیالال کلم کے مقالے چھپتے رہے۔

میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ان دانشوروں کے مقالوں کو لوگ افسانے سمجھ کر پڑھتے تھے۔ لیکن ان میں سیاسی تحریریں بھی ہوتی تھیں جو کہ سیاسی رہنماؤں کو بھی سمجھ میں آتی تھیں۔ عام لوگوں کے فہم سے یہ نہیں بعید تھا کہ اس میں سیاسی، معاشی یا تعلیمی اشاروں کو سمجھیں۔ بلکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک نئے طرز کا افسانہ اخبار میں چھپا ہے۔ اسی لئے پنڈت جواہر لال نہرو یہ پڑھ کر مطمئن تھے اور روز مرہ کے مسائل سے واقف ہوتے تھے۔

یہ اخبار 1931ء میں کشمیری پنڈتوں کی تحریک کا ایک زندہ ثبوت تھا۔ جس تحریک پر گلنسی کمیشن بٹھایا گیا۔ کیونکہ اس اخبار میں ایسے حالات چھپے جس کی وجہ سے کشمیری پنڈتوں نے 1931ء میں تحریک چلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پہلا اخبار تھا جس نے لوگوں میں تحریک کی بیداری پیدا کی۔

1931ء کے بعد متعدد اخبار بھی ریاست جموں و کشمیر میں منظر عام ہوئے جن میں سے پنڈت پریم ناتھ بزاز کا اخبار ''ہمدرد'' اور ثناء اللہ کا ''روزانہ آفتاب'' کشمیر میں رونما ہوئے۔ ان اخباروں نے بھی مختلف ادوار میں لوگوں کے مسائل سامنے رکھ کر ایک قسم کی بیداری لوگوں کے اندر پیدا کی۔ جس سے لوگوں میں ایک تحریک ابھر کر سامنے آئی۔ پہلے پہل اخبار ''ہمدرد'' شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کے زیر اہتمام چلتا رہا اور اس کے بعد شیخ صاحب نے پنڈت پریم ناتھ بزاز کو اخبار چلانے

کے لئے گذارش کی اوراس کے بعد پنڈت پریم ناتھ بزاز ہی اس اخبار کے سربراہ رہے۔

1977ء کے بعد کشمیر میں ایک نئے صحافی کا اخبار رونما ہوا جو کہ آج دنوں بہت ہی مشہور ہے۔وہ ہے ''روزانہ سرینگر ٹائمز'' 1977ء سے پہلے بھی سرینگر ٹائمز چھپتا رہا لیکن اتنی شہرت حاصل نہیں ہوئی جتنی کہ 1977ء سے حاصل ہوئی۔

اس اخبار کے صحافی صوفی غلام محمد تھے۔ جو کہ ایک بلند پایہ افسانہ نگار مانے جاتے تھے۔ انہوں نے کئی افسانے بھی لکھے ہیں۔وادی میں ان کا اخبار اسی لئے مشہور ہوا۔انہوں نے اس اخبار کے پہلے صفحے میں کارٹون چھپوانے کا طریقہ ایجاد کیا جو کہ ریاست جموں وکشمیر کے کسی اخبار والے نے ایجاد نہیں کیا تھا۔اس پر انکو مختلف اعزاز بھی حاصل ہوئے۔

قابل تحسین ہے کہ اردو صحافت نے ریاست جموں وکشمیر میں لوگوں میں انقلاب برپا کردیا۔یعنی سیاسی، معاشی، تعلیمی، سماجی معاملوں میں لوگوں کو بیدار کیا۔1987ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں اردو اخباروں کا رجحان بہت ہی کم نظر آنے لگا کیونکہ روزانہ انگریزی اخبار ریاست جموں وکشمیر میں چھپنے لگے اور اُردو اخباروں کی تجارت کم ہوتی گئی جس سے اردو زبان سے لگاؤ کم ہوتا چلا گیا۔خیر ہمیں اس بات پر فخر ہونا چاہئے کہ ریاست جموں وکشمیر کے مختلف صحافیوں نے اردو ادب اور ادباء کے لئے اپنے اپنے اخباروں بہت ہی اچھا کام کیا ہے۔

اب رہا سوال یہ کہ ریاست جموں وکشمیر میں کس کس طریقے کا انقلاب اُردو صحافت کے ذریعے لوگوں میں لایا گیا۔

ا. جب اُردو اخباری نمائندہ اخبار میں اپنے بیانات تحریر کرتا ہے تو اس وقت وہ اپنی قلم سے لوگوں کے ذہن میں ہیجان انگیز باتیں ڈال کر انقلاب کا تصور پیدا کرتا

ہے۔ مثلاً جب ہم اخبار میں کسی جگہ ظلم ہونے کی خبر پڑھتے ہیں تو لوگوں میں اسکے خلاف آواز اٹھانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور حکومت کے ایوانوں تک یہ بات پہنچ کران میں بھی احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح کی خبروں کے ذریعے حکومت کوئی ٹھوس قدم اٹھانے پر مجبور ہوتی ہے۔

۲. مختلف اخباروں کے مدیر ملکی وشہری ترقی کی خبریں اپنی قلم سے تحریر کر کے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ لوگوں تک ہی نہیں بلکہ سرکاری ایوانوں تک بھی بات پہنچتی ہے۔

۳. اُردو اخبار کے ذریعے سرکار کے کارنامے اوران کی غلطیاں بھی لوگوں تک پہنچاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کس انداز سے لوگوں کے مسائل حل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔

اسی طرح سے بہت سے مسائل اردو اخباروں کے ذریعے سے ہی حل ہوتے ہیں۔ لوگوں کی تحریک خواہ وہ اقتصادی ہو یا سیاسی ہوان کو ہمت پہنچانے والے اردو اخبار ہی ہیں۔

اُردوزبان اور قاعدہ نثر کے مضمون پر بہت سے واقعات لکھنے باقی ہیں۔

میں نے کوشش کی کہ میں بہت سے پرانے اردو اخباروں کے تاثرات اس کتاب میں شائع کروں، لیکن وہ اخبار مہیا ہی نہیں ہوئے۔ میں نے ڈائریکٹر آرکائز کے محکمے کے سربراہوں سے ملاقات کی۔ انہوں نے ان اخباروں کو پیش کرنے کے لئے میرے التماس کو مسترد کر دیا۔ میں نے ان سے گذارش کی کہ میں ان اخباروں کے روزمرہ تبصرے شائع کرانا چاہتا ہوں۔ تا کہ پڑھنے والوں کے سامنے یہ تصور رکھ سکوں کہ کس طرح اس دور میں اخباری نمائندے اپنے قلم سے تاثرات لکھتے تھے۔ لیکن مواد دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ میں اس کتاب میں شائع نہ کرسکا۔ اردو

زبان اور قاعدے نثر میں یہ بھی دلیل وضاحت سے لکھتا ہوں کہ 1931ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں ادیبوں نے کشمیری اور ڈوگری زبان میں ادبی رسالے چھاپے۔ یعنی ریاست کی مختلف زبانوں میں ادبی رسالے بھی چھپ کر منظر پر آئے۔ لیکن اس سے پہلے ریاست جموں وکشمیر میں ادبی ثقافت کی دلیل روزانہ اردو اخباروں میں چھاپی جاتی رہی۔

ایک بات قابل وضاحت ہے کہ اردو اخبار میں کس قسم کا افسانہ ہم روزانہ پڑھتے ہیں۔ اس کو میں اسی لئے افسانہ کہہ رہا ہوں کیونکہ اس میں لکھنے والے حکومت کے خلاف بھی لکھتے ہیں لیکن پردہ فاش نہیں کرتے۔ اسی طرح سے افسانہ نگار افسانہ لکھتے وقت کسی کنبہ یا شخص کی شناخت پوشیدہ رکھتا ہے۔ واقعہ یا کوئی خبر پڑھ کر پڑھنے والے کو معلوم نہیں ہوتا کہ کس کی شکایت کس آدمی سے کی جارہی ہے۔ اسی طرح سے ان خبروں یا واقعات کو سیاسی، اقتصادی، سماجی، افسانہ کہہ سکتے ہیں۔ افسانے میں ہم واقعہ بیان کرتے ہیں لیکن پردے میں اصلی کرداروں کو چھپا کر دوسرے فرضی کرداروں کے نام لے کر ذکر کرتے ہیں۔ اس کو ہم افسانہ کے طرز پر بیان کرتے ہیں جس میں وضاحت بیان نہیں ہوتی۔ جیسا کہ کسی اخبار میں ایک واقعہ چھپا ہے جو کہ بطور مثال پڑھنے والوں کو سمجھایا جارہا ہو کہ کس طرح اردو زبان اور قاعدہ نثر کے مطابق اخباروں میں بھی شکایتیں لکھی جاتی ہیں جس کے ذریعہ پڑھنے والے سرکاری اہلکار غلطیوں کو درست کرتے ہیں۔

''محکمہ تعلیم کی اصلاح''

''محکمہ تعلیم، جو پہلے ہی بہت ساری کوتاہیوں کا مرکز بنا ہوا ہے،

کونیم حکیموں کے سپرد کر کے موت کے دہانے پر پہنچا دیا گیا ہے۔
جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ آج محکمہ عضوئے معطل بن کر رہ گیا ہے۔ محکمہ کے
بعض نا قابل آفیسروں نے انتظامیہ کی ساری لگام کلرک صاحبان کے
سپرد کر دی ہے جو اس کے قواعد و قوانین و حقوق جائزہ کو اپنی مرضی سے
بالائے طاق رکھ کر چلاتے ہیں۔ اس بدنظمی کی مہربانی سے آج کھلے
عام تبادلوں کے لئے رشوت طلب کی جاتی ہے اور مستحق امیدواروں کو
ہر معاملے میں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اسی طرح رہبر تعلیم اسکیم بھی آج
کل لوگوں کے لئے دودھ دینے والی گائے بن گئی ہے۔ آج کل ہر نکڑ،
گلی، شاہراہ پر غیر ضروری سکول کھول کر اپنوں کو موٹی رقومات کے عوض
استاد بنایا جا رہا ہے۔ ایک گھر کو ایک محلّہ دکھا کر نہ صرف نئے سکول قائم
کئے جاتے ہیں بلکہ انہیں اپ گریڈ بھی کیا جاتا ہے۔ جبکہ پرانے
اسکولوں کو ویران اور غیر آباد بنایا جاتا ہے۔ یوں تمام قواعد و ضوابط اور
نارمز کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ لہٰذا حکومت سے گذارش ہے کہ وہ
محکمہ کو قابل، دیانتدار اور ایماندار آفیسروں کے حوالے کرے اور ان
آفیسروں کو نچلی سطح پر تعینات کرے جو دیانتداری اور ذمہ داری کے
احساس سے سرشار ہوں، خصوصی طور محکمہ کو کلرک صاحبان اور رشوت
خور آفیسروں سے بچایا جائے اور رہبر تعلیم کی آڑ میں کئے گئے گھپلوں
اور سکینڈلوں کو بے نقاب کیا جائے۔"

مندرجہ بالا کے پڑھنے سے میرے خیال میں پڑھنے والے سمجھیں گے کہ یہ بھی
ایک روزمرہ کی سرگذشت اخبار میں چھاپی گئی ہے۔ اور پڑھنے والا اسکو افسانہ ہی تصور
کرے گا اور مندرجہ بالا کو پڑھ کر یہ کہے گا کہ یہ اخباری نمائندے نے مختلف

سیاسی، اقتصادی، سماجی، تعلیمی بیانات کو افسانوی انداز میں لوگوں تک پہنچائے ہیں۔ یہ طرز بیان نہ ہی شکایت ہے نہ ہی کسی کے خلاف خاص شکایت تصور کی جائے گی بلکہ محکمہ سے متعلقہ غلطیوں کو آئندہ کے لئے درست کرنے میں کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح سے اردو زبان اور قاعدہ نثر سے ہمیں بہت کچھ معلومات مل سکتی ہیں اور انکا ازالہ کر کے درست بھی کیا جاسکتا ہے۔ خواہ وہ شکایت ہو یا کوئی ایسی ادبی دلیل ہو جس سے پڑھنے والے کو نصیحت حاصل ہوگی۔



منشی پریم چند کے مختلف تہہ خانے

خیال اور فرضی خیال یہ انسانی زندگی میں تبدیلی لانے کے باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً ایسا خیال اگر اچھا نہیں ہے تو اس کو مسترد کردینا چاہیئے۔ تاکہ اچھا خیال ہمارے اندر بحال ہوجائے اور ہماری زندگی میں تبدیلی واقع ہوجائے۔ مثلاً اگر کوئی کسی نشہ آور چیز کا استعمال کرتا ہے لیکن اسکو احساس ہوتا ہے کہ یہ صحت کے لئے بہت ہی مضر ثابت ہوسکتی ہے۔ اس خیال سے کہ اِن نشہ آور چیزوں سے نقصان ہی نقصان ہے تو ان سے پرہیز کر کے انسان صحت مند زندگی اختیار کرسکتا ہے۔ یہ تو ہوئی حقیقی خیال کی بات، اب ہم فرضی خیال کی بات کرتے ہیں۔

فرضی خیال کا استعمال ادب میں زیادہ ہوتا ہے۔ جب کوئی ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، شاعر اپنی تخلیق شائع کر کے لوگوں کو پڑھنے کے لئے پیش کرتا ہے تو اُس کو ہم فرضی خیال کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ ان تخلیقوں کو پڑھنے کے بعد ہماری نظر سے فرضی

خیال کی کئی غلطیاں گذرتی ہیں۔لیکن ہم ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔اس کے لئے ادب نواز دوستوں نے تنقید نگاری کا راستہ اختیار کیا جو کہ اِن غلطیوں کی اصلاح کرنے میں مصنف کی مدد کرتا ہے۔ہم اِس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ فرضی خیال تبدیل نہیں ہوتا وہ موجود رہتا ہے اور اس کی درستگی تنقید نگار ہی کرتا ہے پھر وہ اسے ادب نواز دوستوں اور منصف تک پہنچاتا ہے۔

مصنف کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ تنقید نگار نے اُس کے فرضی خیال پر کچھ غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔جب وہ نئی تخلیق شائع کریگا تو اُن غلطیوں کی اصلاح کر کے نئے انداز سے تحریر کریگا۔

اب کئی مصنفوں کی تخلیق بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے جس میں فرضی خیال بہترین ہونے کے باعث ہم اس تخلیق کو تسلیم کرتے ہیں اور تنقید نگار کو تنقید کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی ۔خود تنقید نگار مانتا ہے کہ فرضی خیال میں مصنف نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔اس قسم کے مصنف مختلف زبانوں میں قدرت کے فضل و کرم سے ملتے ہیں جیسے کہ آج کل کے دور میں منشی پریم چند، ان کے کئی افسانے اور تخلیقی مضمون پڑھ کر ہم قبول کرتے ہیں کہ منشی پریم چند کا قلم ادبی میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ منشی پریم چند موجود نہیں ہیں، بلکہ ہم اُن کی تصنیف پڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ جیسے وہ ہمارے ساتھ بیٹھے ہیں۔یعنی ادبی میدان میں اُن کی قلم تا ابد مقبول عام اور زندہ ہے۔جیسے کہ اُن کی ایک تصنیف کے بارے میں یہ رائے عامہ ہے کہ اس میں غربت کے بارے میں حالات و واقعات پڑھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی یہ واقعات رونما ہوئے ہیں، لیکن جب ہم غور سے پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کام چور بغیر محنت کے رزق حاصل نہیں کر سکتا۔اگر ہم محنت کریں تو ضرور فائدہ اور دولت حاصل ہو سکتی ہے۔اُن کی ایک تصنیف ''کفن'' جس سے ہمیں یہ سبق

ملتا ہے کہ آرام طلبی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور غربت کے وجہ سے رہنے سہنے کا ڈھنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا ''معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا جا دیکھ تو آ''

مادھو دردناک لہجے میں بولا ''مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں۔''

''تو بڑا بے درد ہے بے۔ سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وفائی۔''

''تو مجھ سے اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔''

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لئے انہیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آ جاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے

کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی ان لوگوں کی۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے، دنیا کے مکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے آلو یا مٹرا کھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔

مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر بھی وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کی دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا "جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی۔ چڑیل کا پھنساؤ ہوگا اور کیا۔ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے؟"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ اگر کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا

کہ انہیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم ہوتا تھا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا۔ اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھا۔ اس لئے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

جب ہم غور سے پڑھیں گے اور پڑھ کر سوچیں گے تو اس بات کا خود بخود دعویٰ کریں گے کہ اِس تصنیف میں اُن دِنوں کے تاریخی مناظر بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بات بھی محسوس ہوتی ہے جیسے کہ یہ واقعہ ابھی ہوا ہے اور ایسے مناظر آج بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

اب ہم غور سے منشی پریم چند کی اِس تصنیف کو پڑھتے ہیں۔

''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے۔ پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔''

''لیکن لوگوں کو جواب کیا دیں گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کہ کھن کہاں ہے''

گھیسو ہنسا'' کہہ دیں گے کہ روپیہ کمر سے کھسک گیا۔ بہت ڈھونڈا ملا نہیں۔''

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔

''بڑی اچھی تھی بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔''

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپیہ خرچ ہو گئے صرف تھوڑے سے پیسے بچے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں

کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا، نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پُن نہ ہوگا۔"

مادھو نے فرط عقیدت جھکا کر تصدیق کی "جرور سے جرور ہوگا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بے کنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہر دے سے اُسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

"کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟"

"کہیں گے تمہارا سر"

"پوچھے گی تو جرور"

"تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کپھن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال کیا دنیا میں گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دینگے۔

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے۔"

گھیسو تیز ہو گیا "میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا۔ تو مانتا کیوں نہیں۔"

"کون دے گا۔ بتاتے کیوں نہیں۔"

اوپر کے دلیل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک نشے کے ماحول میں آکر کس طرح

کی باتیں کی جاتی ہیں۔ کس طرح سے نشہ آور چیز کو حاصل کرنے یا نشہ کرنے کے لئے کیا کیا سوچنا پڑتا ہے اور رقم کیسے حاصل کی جاتی ہے۔ نشہ کرنے کیلئے کس طرح پیسے کمائے جاتے ہیں۔ لوگ بے رحم ہو جاتے ہیں جو کہ آج کل کے حالات سے بالکل میل کھاتا ہے۔ آخر کار ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ کس طرح شراب پینے کے لئے برے خیالات کو ذہن میں جگہ دی جاتی ہے اور نشہ آور چیز حاصل کرنے کے لئے پیسے کمائے جاتے ہیں۔ لیکن منشی پریم چند نے ''کفن'' میں اِس بات کا ذکر ہی نہیں کیا ہے کہ وہ لاش کو دفنانے کیلئے پیسے جمع کرتے ہیں اور پیسہ حاصل کر کے وہ لوگ بے رحم ہو جاتے ہیں اور ان پیسوں سے شراب لاتے ہیں اور پینے کے بعد کیا کیا باتیں بناتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

گھیسو نے سمجھایا'' کیوں روتا ہے بیٹا۔ خوش ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہوگئی، جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔''

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھکاوے ٹھگنی

سارا میخانہ محو تماشہ تھا اور یہ دونوں مے کش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

اس تصنیف کو پڑھ کر ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ جمع کئے گئے پیسوں سے شراب کا استعمال کرتے ہیں، مردے کے لئے کفن کا انتظام نہیں کرتے۔ یعنی کفن کے پیسوں کو جمع کر کے شراب خرید لیتے ہیں۔ منشی پریم چند نے اِس بات سے پڑھنے والے کو روشناس نہیں کیا ہے کہ آخر کار اُس لاش کی رسم کیسے انجام دی جاتی ہے۔ کفن چور کے بھاگنے پر لاش کو دیکھنے والوں کو کیسے رحم آیا اور انہوں نے کیسے رسومات انجام

دیئے یہ بات ضرور اس تصنیف میں ہونی چاہیئے تھی خیر پھر بھی اس تصنیف کو ایک تاریخی منظر اور تہہ خانہ سمجھا جائے گا۔

منشی پریم چند نے اپنی تصنیف ''زیور کا ڈبہ'' لوگوں کے سامنے پیش کی۔ جس میں مندرجہ ذیل باتوں سے یہ علم ہوتا ہے کہ ہمیشہ سے ہی بے روزگاری کا مسئلہ تمام دُنیا میں موجود رہا ہے۔ اس مسئلے کا حل نہ ہوسکتا ہے، نہ ہوگا۔ دُنیا میں آبادی دن بدن بڑھتی جارہی ہے اور بے روزگاری کا مسئلہ بھی بڑھ جارہا ہے۔ آبادی کے تناسب سے بے روزگاری کا مسئلہ حل بھی ہوسکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا جو کہ منشی پریم چند کی اس تصنیف سے پڑھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے۔

بی اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ اس کی ماں پہلے ہی مرچکی تھی۔ اسی سال والد بھی چل بسے اور پرکاش زندگی کے جو حسین خواب دیکھا کرتا تھا وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدے پر تھے ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی مگر وہ سب دھری کی دھری رہ گئی۔ اور اب گزراوقات کے لئے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی۔ والد نے کوئی جائیداد نہ چھوڑی۔ الٹا بھوک کا بوجھ اور سر پر لاد دیا اور بیوی بھی ملی تو تعلیم یافتہ، شوقین، زبان کی طرارہ جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مرجانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو تیس روپئے کی نوکری کرتے شرم آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لئے مکان دے کران کے آنسو پونچھ دیئے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ پختہ، ہوادار اور ضروری سامان سے آراستہ۔ ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف دو گھنٹے کا تھا۔ لڑکا تو لگ بھگ انہیں کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن، کام چور، ابھی نویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ اپنا ہی

لڑکا سمجھتے تھے۔ گویا ملازم نہیں گھر کا آدمی تھا اور گھر کے ہر ایک معاملہ میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ پرکاش نے اپنے شاگرد ویراندر کو پڑھا کر چلنے کے لئے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا "ابھی نہ جاؤ بیٹا، ذرا میرے ساتھ آؤ، تم سے کچھ کہنا ہے پرکاش نے دل میں سوچا۔ وہ کیا بات ہے جو ویراندر کے سامنے نہیں کہی جا سکتی، پرکاش کو علیحدہ لے جا کر اومادیوی نے کہا "تمہاری کیا صلاح ہے، ویرو کا بیاہ کر دوں؟ ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے۔

پرکاش نے مسکرا کر کہا۔ "یہ تو ویرو بابو ہی سے پوچھئے"

"نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔"

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا۔ "میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔ ان کا بیسواں سال تو ہے لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔"

"تو ابھی نہ کروں، تمہاری یہی صلاح ہے۔"

"جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔ میں نے تو دونوں باتیں عرض کر دیں۔"

"تو کر ڈالوں؟ مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے پھر پچھتانا پڑے گا۔ کیوں؟"

"میرے رہتے ہوئے تو آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہاں مرضی ہو تو کر ڈالئے، کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔"

"سب تیاریاں تمہیں کرنی پڑیں گی۔۔ یہ سمجھ لو۔"

"تو میں کب انکار کرتا ہوں۔"

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے جو انہیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے۔ پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہوگئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے جنہیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہوں میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہیں تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار منیجر بن بیٹھا ہے۔ کوئی بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے۔

دوسرے واقعہ میں منشی پریم چند اس تصنیف میں پڑھنے والے کو احساس دلاتا ہے کہ ایک پڑھا لکھا آدمی میں کس طرح بددیانتی کا خواب دیکھتا ہے اور دیکھ کر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ جیسے کہ

میں غیر نہیں ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں۔ اگر سو دو سو کی کوئی چیز دے دیتے تو کون سی بڑی بات تھی۔ مگر اہل ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے۔ اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لئے جگہ ہی نہیں رہتی۔“

رات کے بارہ بج گئے ہیں پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آتی۔ بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ بادل گھر آئے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی ہے۔ یکایک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آگیا۔ یہی تو کھانے پینے کی عمر ہے اور اس عمر میں اس بچاری کو ہر ایک چیز کے لئے ترسنا پڑتا ہے۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا تھا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس چھت سے ملی ہوئی تھی۔ بیچ میں ایک پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اُتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا پہلے زینہ سے اتر کر کمرہ میں چلوں۔ اگر وہ جاگ گئے تو زور سے

ہنس دوں گا اور کہوں گا۔ کیا چونکا دیا۔ میرے گھر کی چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا اس لئے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کر رہا ہے۔ کسی کو مجھ پر شک ہی نہیں ہوگا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں۔ سب نوکروں پر شک کریں گے۔ میں بھی کہوں گا صاحب نوکروں کی حرکت ہے۔ اس کے سوا اور کون لے جا سکتا ہے۔ میں تلوہ نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد کوئی دوسرا گھر لے لوں گا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ کرے۔ پھر بھی وہ جب زینہ سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

کس طرح ایک پڑھے لکھے آدمی کو لالچ کے پھندے میں پھنس کر جھوٹ کی شلوار پہننی پڑتی ہے، اور پہن کر کیسی بری باتیں کہتا ہے۔ جیسے کہ

چمپا نے کہا "چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی۔ چور کچھ دیکھ کر ہی جان خطرے میں ڈالتے ہیں۔ یہاں کیا رکھا ہے؟"

پرکاش نے غصہ میں کہا "کچھ نہیں ہے برتن تو ہیں۔ غریب کے لئے تو اپنی ہنڈیا ہی سب کچھ ہے۔"

ایک دن چمپا نے کمرہ میں جھاڑو لگائی تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا۔

"صندوق تم نے ہٹایا تھا؟"

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی۔ جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں اِدھر اُدھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی "میں کیوں ہٹانے لگی؟"

"پھر کس نے ہٹایا؟"

"میں نہیں جانتی"

"گھر میں تم رہتی ہو تو جانے کون؟"

"اچھا اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔"

"کچھ یوں ہی پوچھتا تھا۔"

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں دیکھ نہ لے پرکاش کو چین کہاں چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی۔ وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں، پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں۔ پرکاش کو پکوڑیاں پسند بھی بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے لگی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر اسے بہلانے کے لئے بولا "طشتری میں کیا لائیں؟ آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔ اچھی پکوڑیاں ہیں۔"

آج چمپا کے دل میں شبہ کا وہ اکھوا جیسے ہرا ہو کر لہلہانے اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لئے اس کا دل بیقرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا۔ چمپا کو وہ تالی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آنکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خرید لی اور صندوق کھول ڈالا۔ ارے یہ تو زیور ہیں۔ اس نے ایک زیور نکال کر دیکھا، یہ کہاں سے آ گئے۔ مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔ معاً اس کے دل میں خیال گذرا یہ زیورات ٹھاکر صاحب کے تو نہیں، چیزیں وہی تھیں جن کا تذکرہ کرتے رہتے تھے اسے اب کوئی شک نہیں رہا۔ لیکن اتنی بڑی شرم وندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے ایک دم صندوق بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ان کی اتنی ہمت کیسے پڑی؟ یہ کمینی خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لئے انہیں تنگ نہیں کیا۔ اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں۔ چوری کے زیوروں کیلئے ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا؟

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے وہ محبت نہ رہی۔ نہ وہ عزت کا جذبہ۔ بات بات پر تکرار ہو جاتی۔ پہلے دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہتے تھے مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے، آپس میں ہمدردی تھی، مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے شہر کے ایک بینک میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اوکاؤنٹینٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ نقد دس ہزار روپیہ کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے؟ پرکاش تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک روز ٹھاکر صاحب سے اس معاملے پر بات چیت چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا۔ ''تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟''

پرکاش نے سر جھکا کر کہا ''دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپئے کہاں رکھے ہیں؟''

''اجی درخواست تو دو۔ اگر اور سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔''

پرکاش نے حیران ہو کر کہا ''آپ ضمانت داخل کر دیں گے؟''

''ہاں ہاں یہ کونسی سے بڑی بات ہے؟''

جب کہ میں نے یہ بتایا کہ مصنف نے خود روزگار کے تحت پڑھے لکھے آدمی نے پیسہ کیسے حاصل کیا۔ پھر بھی ایک پڑھے لکھے آدمی کو خود روزگار کا ذریعہ پسند نہیں آتا ہے ایک پڑھا لکھا آدمی سرکاری نوکری یا کسی اچھے کارخانے میں جہاں سے ماہوار تنخواہ بہت ہی اچھی ملے وہی پسند کرتا ہے۔ اسی لئے جب پڑھے لکھے آدمی کو روزگار ملتا ہے اور روزگار حاصل کرنے کے بعد اس سے نیت بدلتی ہے، سرکاری روزگار حاصل کرنے کے بعد ایک پڑھا لکھا آدمی کیسے دیانتداری کا جامہ دوسرے کو پہنا کر یہ دیکھتا

ہے کہ چوری کرنا بہت ہی گناہ ہے۔ جیسے کہ

کئی روز گذر گئے ۔ پرکاش کو بینک میں ملازمت مل گئی ۔ اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب، ان کی اہلیہ ویراندر اور اس کی نئی دلہن آئے ہوئے ہیں، باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں ۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا'' آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا۔ دادا میں اس وقت نہ جانے دوں گا چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی ۔ چار پائیاں نہیں ہیں، بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے۔ رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدے میں ۔ تینوں عورتیں اندر کمرہ میں تھیں ۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔ پرکاش نے گچھا اٹھا لیا۔ پھر کمرہ کھول کر اس میں سے زیورات کا ڈبہ نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کیساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھرتھرا رہے تھے ۔ لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا۔ آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا حرارت سے اضطراب اور خلش سے پر اب بخار کا اتار تھا سکون، فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا۔ تب قدم پیچھے ہٹتا تھا، آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویرو کا کمرہ کھولا اور اندر جا کر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبہ رکھ دیا پھر فوراً باہر آ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ پڑا۔ ہنومان جی سنجیونی بوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اٹھائے جس روحانی سرور کا لطف اٹھا رہے تھے ویسی ہی خوشی پرکاش کو بھی ہو رہی تھی ۔ زیوروں کو اپنے گھر لے جاتے

ہوئے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی۔ گویا کہ کسی گہرائی، اتھاہ گہرائی میں گرا جارہا ہو۔
آج ڈبہ کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ ایروپلین پر بیٹھا ہوا فضا میں اڑا
جارہا ہے اوپر، اوپر اور اوپر۔
وہ گھر پہنچا تو ویرو سویا ہوا تھا۔ چابیوں کا گچھا اس کے سراہانے رکھ دیا۔
ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔
پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا۔
دیکھنا چاہتا تھا وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔
ویراندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔ ماسٹر جی کل آپ کے ہاں کی دعوت
بڑی مبارک تھی۔ جو زیورات چوری ہو گئے تھے سب مل گئے۔
ٹھاکر صاحب بھی آ گئے اور بولے۔ "بڑی مبارک دعوت تھی تمہاری۔ زیور کا ڈبہ
پورا مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی۔ جیسے امانت رکھنے کیلئے ہی لے گیا ہو۔"
پرکاش کو ان باتوں پر یقین کیسے آئے جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔
کہیں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ چوری گیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔
ڈبہ کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا۔ تعجب کی بات ہے۔ میری عقل تو
کام نہیں کرتی۔
ٹھاکر: کسی کی بھی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی تمہاری ہی کیوں۔ ویرو کی ماں تو کہتی ہے
کہ کوئی غیبی معجزہ ہے معجزات پر یقین ہو گیا۔

پرکاش : اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔
ٹھاکر : آج اس خوشی میں ہمارے یہاں دعوت ہوگی۔
پرکاش : آپ نے کوئی منتر ونتر تو نہیں پڑھوا لیا تھا کسی سے......
ٹھاکر : کئی پنڈتوں سے

پرکاش : تو بس اس کی برکت ہے۔

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خوش خبری سنائی۔ وہ دوڑ کر اس کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا ''آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے''

''میں بھی ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔''

''تم تو سینکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو۔''

''مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہوگا۔''

پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''

اب ہمیں اس تصنیف سے یا پہلے کی تصنیف سے یہ محسوس ہوا جیسے کہ یہ واقعہ آج ہوا ہے اور سمجھتے ہیں کہ منشی پریم چند کی تصنیف زمانہ حال سے وابستہ ہے اور زمانہ مستقبل کے ساتھ بھی جوڑ کھا سکتی ہے۔

ہم برصغیر کے ادیبوں کے تاثرات اور رُجحان اپنے ملک کے ماحول کے مطابق پڑھتے ہیں۔ جس قسم کا بھی مواد ہو چھپواتے ہیں جو زیادہ تر اپنے ماحول کے مطابق بیان کیا جاتا ہے۔ اگر چہ ہم منشی پریم چند کا افسانہ پڑھتے ہیں ان افسانوں میں بھی یہی کچھ ملتا ہے۔ جس طریقے سے پریم چند اپنے دور میں ماحول کا جائزہ کرتے ہیں اُسی انداز سے اُس نے اپنی تحریر کو لوگوں تک پہنچایا۔ یعنی اس کی زبان اُس کا طور طریقہ ملک کے ماحول کے مطابق ہی پایا جاتا ہے مثلاً جب ہم پریم چند کے افسانہ ''حج اکبر'' کا مطالعہ کرینگے تو ہم کو معلوم ہوگا کہ منشی پریم چند نے روایت کے مطابق اس افسانے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اگر چہ اس افسانے میں عنوان اچھا نہیں ہے لیکن خیالات سے بھرپور اور خیالات کے مطابق ہم عنوان کو بھی تسلیم کر سکتے ہیں۔

پہلے پہل ہم اس افسانے میں یہ پڑھتے ہیں کہ آج کل کے زمانے کے واقعات کے مطابق یہ افسانہ لکھا گیا ہے۔ اگر چہ منشی پریم چند اس دُنیا سے چل بسے لیکن اُن کا خیال اور قلم تا ابد ادبی میدان میں روشن افزوں ہے۔ اس افسانے کو پڑھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ واقعہ ابھی ابھی ہوا ہوگا۔

آج کل ملک میں کم از کم چالیس فیصدی عورتیں مردوں کے ہمراہ کام کرتی ہیں۔ کئی عورتیں سرکاری محکموں میں یا غیر سرکاری محکموں میں اپنا کام کاج سنبھالتی ہیں۔ اب جبکہ عورتیں دن بھر اپنے کاروبار کے لئے جاتی ہیں تو مسئلہ اُن کے بچوں کی پرورش کا آتا ہے۔ کئی عورتیں اپنے بچوں کو ماں یا کسی دوسرے کے حوالے کر جاتی ہیں۔ کئی عورتیں بچوں کے دیکھ بھال کے لئے دائی رکھتی ہیں۔ کئی لوگ نوکر رکھ گھر میں بچے کی پرورش کراتے ہیں۔ اس طرح سے منشی پریم چند کے افسانے ''جج اکبر'' میں پڑھ کر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسا کہ جب ایک دائی کو منشی صابر حسین اپنے بیٹے کی پرورش کے لئے رکھتا ہے تو اسی کے زیر اہتمام بچے کی پرورش ہوتی ہے۔ صابر حسین کی گھر والی اس کو 3 سال کے بعد نکالتی ہے، لیکن یہ دائی جب گھر سے نکلتی ہے تو بچے کی پرورش اچھی نہیں رہتی۔ یہ دائی اس گھر میں ایسی مخصوص ہوئی کہ لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ شاید یہ نانی ہے، وہ دائی نہیں سمجھتے تھے۔ اب منشی پریم چند کی قلم سے ہی ہمیں معلوم ہو جائے گا۔

اتفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں ذرا دیر ہوگئی۔ وہاں دو کنجڑنوں میں بڑے جوش وخروش سے مناظرہ ہو رہا تھا۔ ان کی مصور طرز ادا، ان کا اشتعال انگیز استدلال، ان کی مشکل تضحیک۔ ان کی روشن شہادتیں اور منور روایتیں، ان کی تعریف اور تردید سب بے مثال تھیں۔ زہر کے دو دریا تھے یا دو شعلے جو دونوں طرف سے اُمڈ کر باہم گتھ گئے تھے۔ کیا روانی زبان تھی۔ گویا کوزے میں دریا بھرا ہوا۔ ان کا جوش اظہار

ایک دوسرے کے بیانات کو سننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی، تخیل کی ایسی نوعیت، اسلوب کی ایسی جدت، مضامین کی ایسی آمد، تشبیہات کی ایسی موزونیت اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون شاعر ہے جو رشک نہ کرتا۔ صفت یہ تھی کہ اس مباحثہ میں تلخی یا دل آزاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دونوں بلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت ان کا ضبط، ان کا اطمینان سب حیرت انگیز تھا۔ ان کے ظرف دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدر جہاز یادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی۔ الغرض یہ خالص دماغی، ذہنی مناظرہ تھا۔ اپنے اپنے کمالات کے اظہار کے لئے ایک خالص زور آزمائی تھی اپنے اپنے کرتب اور فن کے جوہر دکھانے کے لئے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ وہ مبتذل کنایات واشارے جن پر بے شرمی کو شرم آتی وہ کلمات رقیق جن سے عفونت بھی دور بھاگتی ہزاروں رنگین مزاجوں کے لئے محض وقت کا مطلق احساس نہ ہوا۔ اچانک نو بجنے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا۔ وہ لپکی ہوئی گھر کی طرف چلی۔

شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی۔ کیا بازار میں کھوگئی تھیں؟ دایہ نے خطاوارانہ انداز سے سر جھکالیا۔ اور بولی۔ بی بی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہوگئی اور باتیں کرنے لگی۔

شاکرہ جواب سے اور بھی برہم ہوئی۔ یہاں دفتر جانے کو دیر ہورہی ہے۔ تمہیں سیر سپاٹے کی سوجھی ہے۔ مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھی۔

بچہ کو گود میں لینے چلی پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا" رہنے دو تمہارے بغیر بے حال نہیں ہوا جاتا۔

دایہ نے اس کی حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی۔ بیگم صاحبہ کا غصہ دور کرنے کی اس سے زیادہ کارگر کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی۔ اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا وہ

دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ دایہ نے اسے گود میں اٹھالیا اور دروازہ کی طرف چلی لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی "تمہارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں یہ تماشے کسی اور کو دکھایئے۔ یہاں طبیعت سیر ہوگئی۔"

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان یہ ایسا مضبوط تعلق تھا جسے معمولی ترشیاں کمزور نہ کرسکتی تھیں۔ اسی وجہ سے شاکرہ کی سخت زبانیوں کا اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ واقعی مجھے نکالنے پر آمادہ ہے۔ پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے رُخی سے کہیں اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھین لیا کہ دایہ سے ضبط نہ ہوسکا۔ بولی

"بی بی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔ بہت ہوگا تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہوگی۔ اس پر آپ جتنا جھلا رہی ہیں صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا دروازہ دیکھو۔ اللہ نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی دے گا۔ مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے۔

شاکرہ: تو یہاں تمہاری کون پرواہ کرتا ہے۔ تمہاری جیسی مامائیں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

دایہ: ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ مامائیں دائیاں بہت ملیں گی۔ جو کچھ خطا ہوتی ہو، معاف کیجئے گا۔ بس جاتی ہوں۔

شاکرہ: جا کر مردانے میں اپنا حساب کرلو۔

دایہ: میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائیاں منگوا دیجئے گا۔

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آگئے۔ پوچھا "کیا ہے؟"

دایہ: کچھ نہیں، بی بی نے جواب دے دیا ہے۔ گھر جاتی ہوں۔

صابر حسین خانگی تردرات سے ایسے بچتے تھے۔ جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے

بچے ۔ انہیں سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا پر کانٹوں پر پیر رکھنے کی جرأت نہ تھی ۔ چیں بہ جبیں ہو کر بولے "کیا بات ہوئی ؟"

شاکرہ: کچھ نہیں ، جی نہیں چاہتا ہے اسکور کھنے کا۔ کسی کے ہاتھوں بک تو نہیں گئے ۔

صابر: تم بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سوچتی رہتی ہو۔

شاکرہ: ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے ۔ کیا کروں؟ خصلت ہی ایسی ہے۔ تمہیں یہ بہت پیاری ہے تو جا کر گلے باندھو۔ میرے یہاں ضرورت نہیں ہے۔

دایہ گھر سے نکلی تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں۔ دل نصیر کے لئے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچے کو گود میں لے کر پیار کر لوں۔ پر یہ حسرت لئے اسے گھر سے نکلنا پڑا۔

اُوپر کے ان واقعات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کن باتوں سے تو تو میں میں کے جھگڑے ہوتے ہیں لیکن بچے کی ماں پھر محسوس کر رہی ہے کہ میں نے دایہ کو جو میرے بچے کی پرورش کرتی اُس کو کیوں گھر سے نکالا ۔ جیسے کہ

صابر: نہیں معاف کرو۔ مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں ہے۔ نہ جانے تمہارے منہ سے کیا نکل جائے کہ وہ آئی بھی ہو تو نہ آئے۔

شاکرہ نے شوہر کی طرف نگاہ ملامت سے دیکھ کر کہا۔ "ہاں اور کیا! مجھے اپنے بچے کی بیماری کا قلق تھوڑے ہی ہے۔ میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اسے کب کی منا لائی ہوتی۔ وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو لیکن نصیر سے اسے محبت تھی۔ میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی ، اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کر دوں گی اور جس طرح راضی ہوگی ، اسے راضی کروں گی۔"

شاکرہ نے بہت ضبط کر کے یہ باتیں کہیں مگر امڈے ہوئے آنسو اب نہ رک سکے۔

صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہوکر بولے۔ ''میں تمہارا جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں خود ہی جاتا ہوں۔''

عباسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب درخت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے ساری پتیاں گرادیں۔ بادِ حوادث نے درخت کو پامال کردیا اور اب یہی سوکھی ٹہنی ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پاکر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری ہری پتیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جواب تک خشک اور پامال تھی۔ اس میں پھر رنگ و بو کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اندھیرے بیاباں میں بھٹکتے ہوئے مسافر کو شمع کی ایک جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اب اس کا جوئے حیات سنگ ریزوں سے نہ ٹکراتا تھا۔ وہ اب ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا۔ اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی۔ اس میں معنی پیدا ہو گئے تھے۔

عباسی نصیر کی بھولی بھولی باتوں پر نثار ہوگئی مگر وہ اپنی محبت کو شاکرہ سے چھپاتی تھی۔ اس لئے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو۔ وہ نصیر کے لئے ماں سے چھپا کر مٹھائیاں لاتی اور اسے کھلا کر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو دو تین تین بار اسے ابٹن ملتی کہ بچہ خوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی کہ بچے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچے کی کم خوری کا رونا رویا کرتی اور اسے نظر بد سے بچانے کے لئے تعویذ اور گنڈے لاتی رہتی۔ یہ اس کی خالص مادرانہ محبت تھی۔ جس میں اپنی روحانی احتیاج کے سوا کوئی غرض نہ تھی۔

اس گھر سے نکل کر آج عباسی کی وہ حالت ہوگئی جو تھیٹر میں یکا یک بجلی کے گل ہو جانے سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی، کانوں میں وہی پیاری پیاری باتیں گونج رہی تھیں۔ اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ اس کال کوٹھری میں دم گھٹا جاتا تھا۔

رات جوں توں کر کے کٹی۔ صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی۔ یکا یک تازے حلوے کی صدا اس کر بے اختیار باہر نکل آئی۔ معاً یاد آ گیا آج حلوہ کون کھائے گا؟ آج گود میں بیٹھ کر کون چہکے گا۔ وہ نغمہ مسرت سننے کے لئے جو حلوہ کھاتے وقت نصیر کی آنکھوں سے ہونٹوں سے اور جسم کے ایک ایک عضو سے برستا تھا۔ عباسی کی روح تڑپ اٹھی۔ وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں نصیر کو دیکھ آؤں پر آدھے راستہ سے لوٹ آئی۔

دایہ بھی بچے پر تڑپی اور کیا کہتی؟ جیسا کہ

نصیر عباسی کے دھیان سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ اترتا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی۔ معلوم ہوتا نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسیوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی۔ اس کے گھر کوئی آتا تو نصیر ہی کا ذکر کرتی نصیر اس کے دل اور جان میں بسا ہوا تھا۔ شاکرہ کی بے رخی اور بدسلوکی کے ملال کے لئے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی اس لئے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی۔ گھر سے چلتی لیکن کبھی آدھے راستہ سے لوٹ آتی کبھی دو چار قدم سے آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون سا منہ لے کر جاؤں؟ جو محبت کو فریب سمجھتا ہو اسے کونسا منہ دکھاؤں۔ کبھی سوچتی کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو! بچوں کی محبت کا اعتبار کیا؟ نئی دایہ سے رچ گیا ہو۔ یہ خیال اس کے پیروں پر زنجیر کا کام کر جاتا تھا۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ عباسی کا دل ہر دم اچاٹ رہتا جیسے کوئی لمبا سفر اسے درپیش ہو۔ گھر کی چیزیں جہاں کی تہاں پڑی رہتیں۔ نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ بدنی ضروریات بھی خلاء دل کو پر کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اسی اثناء میں حج کے دن آ گئے۔ محلّہ میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے۔ عباسی کی حالت اس وقت

پالتو چڑیا کی سی تھی جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشہ کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے تئیں بھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا۔ آمادہ سفر ہوگئی۔

اوپر واقعات پڑھنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ منشی پریم چند نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ایک بچہ ایک دایہ کے بغیر کتنا ترستا ہے جب اُس کی ماں اسے لاڈ پیار دیتی ہے لیکن ماں نے گود کا پیار نہیں دیا اور پیار کا سودا دایہ نے خریدا جس کی وجہ سے بچہ ہمیشہ اُسی کو یاد کرتا ہے اور دایہ بھی بچے کے لئے تڑپتی ہے۔ بچہ اپنی ماں کے سامنے صحت یاب نہیں ہوتا ہے بلکہ صحت سے دن بدن کمزور ہوتا جارہا ہے کیونکہ بچے کی پرورش دایہ ہی کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے بچہ دایہ کو ماں سمجھ کر اور اس کے جدائی پر ترستا ہے۔ اس صحت یابی کیلئے اب اور لختِ جگر ہونے کی وجہ سے اسکے ماں باپ دایہ کے پاس جا کر کیا کہہ رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

یکا یک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لئے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا۔ ان کا چہرہ اترا ہوتھا اور کپڑے تر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے گئے۔ عباسی محض یہ دکھانے کے لئے کہ میں بھی حج کرنے جارہی ہوں، گاڑی سے باہر نکل آئی۔ صابر حسین اسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے اور بولے ’’کیوں عباسی! تم بھی حج کو چلیں؟‘‘

عباسی نے فخریہ انکسار سے کہا ’’ہاں یہاں کیا کروں؟ زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہوجائیں۔ خدا کے یہاں منہ دکھانے کے لئے بھی تو کوئی سامان چاہئے۔ نصیر میاں تو اچھی طرح ہیں؟‘‘

صابر: اب تو تم جارہی ہو۔ نصیر کا حال پوچھ کر کیا کروگی۔ اس لئے دعا کرتی رہنا۔

عباسی کا سینہ دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر بولی ’’کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے؟‘‘

صابر: اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے۔ جس دن تم وہاں سے نکلیں۔ کوئی

دو ہفتہ تک توانا انا کی رٹ لگا تار ہا اور اب ایک ہفتہ سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ ساری دوائیں کر کے ہار گیا۔ کوئی فائدہ ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا چل کر تمہاری منت سماجت کر کے لے چلوں۔ کیا جانے تمہیں دیکھ کر اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے لیکن تمہارے گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ تم حج کرنے جا رہی ہو۔ اب کس منہ سے چلنے کو کہوں۔ تمہارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھا کیا تھا کہ اتنی جرأت کر سکوں اور پھر کار ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے۔ جاؤ اس کا خدا حافظ ہے۔ حیات باقی ہے تو صحت ہو ہی جائے گی ورنہ مشیت ایزدی سے کیا چارہ؟''

عباسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ دل سے دعا نکلی ''اللہ میری جان کے صدقے میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو۔'' رقت سے گلا بھر آیا۔ ''میں کیسی سنگ دل ہوں۔ پیارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو گیا اور میں اسے دیکھنے تک نہ گئی۔ شاکرہ بدمزاج سہی، بدزبان سہی۔ نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا۔ یا خدا میرا گناہ بخشیو! پیارا نصیر میرے لئے ہڑک رہا ہے۔ (اس خیال سے عباسی کا کلیجہ مسوس اٹھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے) مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبت ہے ورنہ شاکرہ کی جوتیاں کھاتی اور گھر سے قدم نہ نکالتی۔ آہ! نہ معلوم بچارے کی کیا حالت ہے۔'' انداز وحشت سے بولی۔

''دودھ تو پیتے ہیں نا!''

صابر: تم دودھ پینے کو کہتی ہو۔ اس نے دو دن سے آنکھیں تو کھولی نہیں۔

عباسی: یا میرے اللہ! ارے اوقلی! بیٹا! آکے میرا اسباب گاڑی سے اتار دے۔ اب مجھے حج وج کی نہیں سوجھتی۔ ہاں بیٹا جلدی کر۔ میاں! دیکھئے کوئی یکہ ہو تو ٹھیک کر لیجئے۔''

یکہ روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عباسی بار بار جھنجھلاتی تھی اور یکہ بان سے کہتی تھی "بیٹا جلدی کرمیں تجھے کچھ زیادہ دیدوں گی" راستہ میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اسے غصہ آرہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کاش گھوڑے کے پر لگ جاتے۔ لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آگیا تو عباسی کا سینہ زور سے اچھلنے لگا، سر تیورا گیا۔ بار بار دل سے دعا نکلنے لگی۔ سب خیر وعافیت ہو۔

یکہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔ دفعتاً عباسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ سر تیورا گیا۔ معلوم ہوا دریا میں ڈوبی جاتی ہوں۔ جی چاہا یکہ سے کود پڑوں۔ مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا کہ عورت میکے سے وداع ہورہی ہے۔ تسکین ہوئی۔

آخر صابر حسین کا مکان آپہنچا۔ عباسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھوکا پیاسا گھر آئے اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔ دروازہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ باورچی بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ عباسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولٹس پکار ہی ہے۔ کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی تو اس کا دل گرما کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔ شاکرہ نصیر کو گود میں لیے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔ غم اور یاس کی زندہ تصویر۔

عباسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ نصیر کو اس کی گود سے لے لیا اور اس کے منہ کی طرف چشم پرنم سے دیکھ کر کہا "بیٹا نصیر آنکھیں کھولو!"

نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا۔ تب یکایک دایہ کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا "انا آئی۔ انا آئی"

نصیر کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جائے ایسا معلوم ہوا گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔ صابر حسین نے آ کر اسے گود میں اٹھالیا اور پیار کر کے بولے ''تمہاری انا کو مار بھگا دیں؟ نصیر نے منہ بنا کر کہا ''نہیں روئے گی۔''

عباسی بولی ''کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا؟''

صابر حسین نے مسکرا کر کہا۔ ''تمہیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ملیگا۔ اس حج کا نام حج اکبر ہے۔''

منشی پریم چند اُن واقعات کو اِس افسانے میں لکھ کر یہ بتاتے ہیں کہ اولاد کی محبت میں ماں باپ کیا کچھ کرتے ہیں اور یہ بھی وضاحت سے بیان کرتے ہیں کہ اگر ماں باپ بچے کو سونا بھی پیش کر دیں لیکن اگر پیار نہیں کریں تو ماں باپ بچے کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں جیسے کہ بچہ دایہ کے لئے ترستا ہے کیونکہ دایہ اُس سے محبت کرتی ہے نہ کہ دِکھاوا اگرچہ ماں باپ مالی طور سے اور دیگر طریقوں سے بچے کو محبت کرتے ہیں، لیکن گود میں نہ بٹھانے اور پیار نہ کرنے کی وجہ سے وہ محبت سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔

اگر ہم غور سے اس افسانے کو پڑھیں تو ہمیں اِس بات کا شکوہ کرنا پڑے گا کہ منشی پریم چند نے اس افسانے کا عنوان ''حج اکبر'' اچھا نہیں چنا ہے۔ کیونکہ اِس میں بچے کی محبت اور پرورش کا ذکر آیا ہے۔ اسی لئے اس افسانے کے عنوان ''پرایہ خون کی کشش'' یا ''لختِ جگر'' ہونا چاہئے۔ اگرچہ مصنف نے سفر محمود کا ذکر کیا ہے کہ ایک دایہ بچے کی پرورش اور پیار کرنے کے لئے سفر محمود کا دورہ منسوخ کرتی ہے لیکن پھر بھی ''حج اکبر'' کا

عنوان اچھا تصور نہیں کیا جاتا۔

ابھی تک ہم نے منشی پریم چند کے تین افسانوں پر مباحثے کئے، لیکن ان تینوں افسانوں میں تاریخی، سماجی مواد بھی ہے اور غربت کے اندازے کے مطابق رہن سہن بھی ہے۔ مطلب ہر ایک کی ترجمانی ان افسانوں میں ملتی جلتی ہے۔

منشی پریم چند نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک کہانی ''دو بیلوں'' کی کہانی ہے۔ ہمیں اس کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ کس طرح ایک جانور یا حیوان کی تشبیہ دے کر پڑھنے والے کے لئے نصیحت فراہم کی گئی ہے جیسے کہ مالک دو بیلوں کو پالتا ہے اور بعد میں اُن دونوں کو سسرال بھیجتا ہے۔ پہلے منشی پریم چند جی نے اس بات سے روشناس کیا ہے کہ بیل کو گدھے کی طرح بے وقوف حیوان تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن پریم چند نے بیل کو اتنا بے وقوف نہیں تسلیم کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

لیکن گدھے کا بھائی اور بھی ہے جو اس سے کچھ ہی کم گدھا ہے اور وہ بیل ہے۔ جن معنوں میں ہم گدھے کا لفظ استعمال کرتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بیل کو بے وقوفوں کا سردار کہنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارا خیال ایسا نہیں ہے بیل کبھی کبھی اڑیل بھی دیکھنے میں آتے ہیں اور کبھی کبھی کئی طریقوں سے وہ اپنی پسندیدگی اور ناراضی کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اس کا درجہ گدھے سے نیچا ہے۔

منشی پریم چند نے دو بیلوں کی کہانی میں انکے نام ہیرا اور موتی رکھ کر پڑھنے والوں کو تشبیہ دے کر کہانی کو سمجھانے کے لئے ہمیں روشناس کرایا ہے۔ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی، یہی محاورہ استعمال کر کے منشی پریم چند نے اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ کیسے دو بیل اپنے جرأت مندانہ مختلف طریقوں سے انجام دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم آپس میں اتفاق سے رہیں گے تو ہمیں بہت فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔

ممکن ہے کہ منشی پریم چند نے اس کہانی کو اسی لئے لکھا ہوتا کہ ملک میں انسانی رواداری قائم ودائم رہے۔ دو بیلوں کی تشبیہ دے کر ہمیں یہ نصیحت دے رہا ہے کہ کس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق رکھ کر نئے نئے طریقے کے کام انجام دئے جا سکتے ہیں اور اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ ایک مالک کس طرح ان حیوانوں کو پالتا ہے لیکن جب ان کو سسرال بھیجتا ہے تو وہاں پر ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا ہے۔ اس بات پر مالک کی بیوی مالک کو کہتی ہے کہ صرف حیوانوں کو بھوسا کھلا کر اپنی زندگی کا دور ختم کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے ایک کا نام ہیرا تھا۔ دوسرے کا موتی دونوں بچھائیں نسل کے تھے۔ دیکھنے میں خوبصورت کام چوکس۔ ڈیل ڈول میں اونچے بہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے تھے۔ دونوں میں محبت سی ہوگئی تھی۔ دونوں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھے زبان خاموش میں ایک دوسرے سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کیونکر سمجھ جاتے تھے یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ضرور ان میں کوئی ناقابل فہم قوت تھی جس کے سمجھنے سے اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی انسان محروم ہے۔

دونوں ایک دوسرے کو چاٹ کر اور سونگھ کر اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے کبھی کبھی دونوں سنگیں ملا لیا کرتے تھے۔ عناد سے نہیں محض زندہ دلی سے ہنسی مذاق سے جیسے یار دوستوں میں بھی کبھی ڈھول دھپا ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر دوستی کچھ پھیکی سی اور ہلکی سی رہتی ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جس وقت یہ دونوں بیل ہل یا گاڑی میں جوتے جوتے اور گردنیں ہلا ہلا کر چلتے تو ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ زیادہ بوجھ میری ہی گردن پر رہے۔ کام کے بعد دوپہر یا شام کو کھلتے تو ایک دوسرے کو چوم چاٹ کر اپنی تکان اتار لیتے۔ ناند میں کھلی بھوسہ پڑ جانے کے بعد دونوں ایک

ساتھ اٹھتے ایک ساتھ ناند میں منہ ڈالتے اور ایک ہی ساتھ بیٹھتے۔ ایک منہ ہٹالیتا تو دوسرا بھی ہٹالیتا۔

ایک بار جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لئے اپنی سسرال بھیجے بیلوں کو کیا معلوم وہ کیوں بھیجے جا رہے ہیں؟ سمجھے مالک نے ہمیں بیچ دیا کون جانے بیلوں کو اپنا بیچا جانا پسند آیا یا نہیں۔ لیکن جھوری کے سالے کو انہیں اپنے گاؤں تک لے جانے میں دانتوں میں پسینہ آ گیا۔ پیچھے سے ہانکتا تو دونوں دائیں بائیں بھاگتے آگے سے پکڑ کر کھینچتا تو دونوں پیچھے کو زور لگاتے مارتا تو دونوں سینگ نیچے کر کے پھنکارتے۔ اگر ان بے زبانوں کی زبان ہوتی تو جھوری سے پوچھتے تم نے ہم غریبوں کو کیوں نکال دیا۔ ہم نے تمہاری خدمت کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اتنی محنت سے کام کرتے تھے اور کام کرنے میں ہمیں انکار نہ تھا۔ ہمیں تمہاری خدمت میں مر جانا بھی قبول تھا۔ ہم نے کبھی دانے چارے کی شکایت نہیں کی۔ تم نے جو کچھ کھلایا سر جھکا کر کھایا۔ پھر تم نے ہمیں اس ظالم کے ہاتھ کیوں بیچ دیا۔

شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گاؤں جا پہنچے۔ دن بھر کے بھوکے تھے لیکن جب ناند میں لگائے گئے تو کسی نے بھی اس میں منہ نہ ڈالا۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا جسے انہوں نے اپنا گھر سمجھا تھا وہ آج ان سے چھوٹ گیا یہ نیا گھر نیا گاؤں نئے آدمی......سب انہیں بیگانے سے لگتے تھے۔ دونوں نے چپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا اور لیٹ گئے۔ جب گاؤں میں سونا پڑا تو دونوں نے زور مار کر پگھے تڑا لئے اور گھر کی طرف چلے۔ پگھے بہت مضبوط تھے کسی کو شبہ بھی نہ ہوسکتا تھا کہ بیل انہیں توڑ سکیں گے پر ان دونوں میں اس وقت دگنی طاقت آ گئی تھی۔ ایک جھٹکے میں رسیاں ٹوٹ گئیں۔

جھوری نے صبح اٹھ کر دیکھا دونوں بیل چرنی میں کھڑے تھے۔ دونوں کی گردنوں

میں آدھا آدھا رسا لٹک رہا تھا۔ گھٹنوں تک پاؤں کیچڑ سے بھر ہوئے تھے۔ اور دونوں کی آنکھوں میں محبت کی ناراضی جھلک رہی تھی۔ جھوری ان کو دیکھ کر محبت سے باؤلا ہو گیا اور دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔

انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہایت دلکش تھا۔

گھر اور گاؤں کے لڑکے جمع ہو گئے اور تالیاں بجا بجا کر ان کا خیر مقدم کرنے لگے۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا نہ تھا مگر اہم ضرور تھا۔ بال سبھا نے فیصلہ کیا کہ دونوں بہادروں کو ایڈریس دیا جائے۔ کوئی اپنے گھر سے روٹیاں لایا۔ کوئی گڑ کوئی بھوسی۔

ایک لڑکے نے کہا ''ایسے بیل کسی کے پاس نہ ہوں گے۔''

دوسرے نے تائید کی ''اتنی دور سے دونوں اکیلے چلے آئے۔''

تیسرا بولا ''پچھلے جنم میں ضرور آدمی ہوں گے۔''

اس کی تردید کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ سب نے کہا ''ہاں بھئی ضرور ہوں گے۔''

جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازہ پر دیکھا تو جل اٹھی بولی

کیسے نمک حرام بیل ہیں۔ ایک دن بھی وہاں کا نہ کھایا۔ بھاگ کھڑے ہوئے۔

جھوری اپنے بیلوں پر یہ الزام برداشت نہ کر سکا بولا۔ ''نمک حرام کیوں ہیں؟ چارہ دانہ نہ دیا ہوگا۔ تو کیا کرتے!۔''

آخر کار منشی پریم چند جی نے دو بیلوں کے کارنامے بتا کر یہ دیکھایا ہے کہ کس طرح دو بیل بھاگنے کے بعد آپس میں کس طرح کی کانا پھوسی کرتے ہیں جیسے کہ

دوسرے دن دونوں دوست کانجی ہاؤس میں بند تھے۔

ان کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ سارا دن گزر گیا اور کھانے کو ایک تنکا بھی نہ

ملا۔ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ یہ کیسا مالک ہے۔

وہاں کئی بھینسیں تھیں۔ کئی بکریاں، کئی گھوڑے، کئی گدھے مگر چارہ کسی کے سامنے نہ تھا سب زمین پر مردے کی طرح پڑے تھے۔ کئی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ سارے دن دونوں دوست دروازے کی طرف دیکھتے رہے مگر کوئی چارہ لے کر نہ آیا۔ غریبوں نے دیوار کی نمکین مٹی چاٹنی شروع کی مگر اس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی۔

رات کو بھی جب کھانا نہ ملا تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوئے۔

موتی سے بولا'' مجھے تو معلوم ہوتا ہے جان نکل رہی ہے۔''

موتی ''اتنی جلدی ہمت نہ ہارو بھائی! یہاں سے بھاگنے کا کوئی طریقہ سوچو؟''

ہیرا'' آؤ دیوار توڑ ڈالیں؟''

موتی ''مجھ سے تو اب کچھ نہ ہوگا؟''

ہیرا''اسی بوتے پر اکڑتے تھے؟''

موتی ''ساری عقل نکل گئی بھائی!''

باڑے کی دیوار کچی تھی۔ ہیرا نے اپنے نوکیلے سینگ دیوار میں گاڑ دیئے اور زور مارا تو مٹی کا چپڑ نکل آیا۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے دوڑ دوڑ کر دیوار سے ٹکریں ماریں۔ ہر ٹکر میں تھوڑی مٹی گرنے لگی۔''

اتنے چوٹیں ماریں کہ کانجی کا چوکیدار لالٹین لے کر جانوروں کی حاضری لینے آنکلا۔ ہیرا کی یہ وحشت دیکھ کر اس نے اسے کئی ڈنڈے رسید کئے اور موٹی سے رسی سے باندھ دیا۔ موتی نے پڑے پڑے اس کی طرف دیکھا۔ گویا زبان حال سے کہا'' آخر مار کھائی۔ کیا ملا؟''

ہیرا''زور تو آزما لیا۔''

موتی ''ایسازور کس کام کااور بندھن میں پڑ گئے۔''

ہیرا''اس سے باز نہ آؤں گا خواہ بندھن پڑتے جائیں۔''

موتی ''جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے''

ہیرا''اس کی مجھے پرواہ نہیں ہے۔ یوں بھی تو مرنا ہے ذرا سوچو اگر دیوار گر جاتی تو کتنی جانیں بچ جاتیں۔ اتنے بھائی یہاں بند ہیں کسی کے جسم میں جان ہی نہیں ہے۔ دو چار دن اور یہی حال رہا تو سب مر جائیں گے۔

موتی ''ہاں یہ بات ہے تو میں بھی زور لگاتا ہوں۔''

موتی نے بھی دیوار میں ٹکریں ماریں۔ تھوڑی سی مٹی گری اور ہمت بڑھی تو دیوار میں سینگ لگا کر اس طرح زور کرنے لگا جیسے کسی سے لڑ رہا ہو۔ آخر دو گھنٹہ کی قوت آزمائی کے بعد دیوار کا کچھ حصہ گر گیا۔ اس نے دوگنی طاقت سے دوسرا دھکا لگایا تو آدھی دیوار گر پڑی۔

دیوار کا گرنا تھا کہ نیم جان جانور اٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں گھوڑیاں بھاگ نکلیں بھیڑ بکریاں نکلیں۔ اس کے بعد بھینسیں بھی کھسک گئیں پر گدھے ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔

ہیرا نے پوچھا''تم کیوں نہیں بھاگ جاتے؟''

ایک گدھے نے کہا''کہیں پھر پکڑ لئے جائیں تو......؟''

ہیرا'' پکڑ لئے جاؤ تو اس وقت دیکھا جائے۔ اس وقت تو موقع ہے۔''

گدھا''ہمیں ڈر لگتا ہے ہم نہ بھاگیں گے۔''

آدھی رات گزر چکی تھی۔ دونوں گدھے کھڑے سوچ رہے تھے بھاگیں یا نہ بھاگیں موتی اپنے دوست کی رسی کاٹنے میں مصروف تھا۔ جب وہ ہار گیا تو ہیرا نے کہا''تم جاؤ مجھے یہیں رہنے دو۔ شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔''

موتی نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا ''تم مجھے اتنا خود غرض سمجھتے ہو ہیرا؟ ہم اور تم اتنے دنوں سے ساتھ رہے۔ آج تم مصیبت میں پھنسے تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔''

ہیرا ''بہت مار پڑے گی۔ سمجھ جائیں گے یہ تمہاری شرارت ہے۔''

موتی ''جس قصور کیلئے تمہارے گلے میں رسہ پڑا ہے اس کے لئے اگر مجھ پر مار پڑے تو کیا بات ہے۔ اتنا تو ہو گیا کہ دس جانوروں کی جان بچ گئی!''

یہ کہہ کر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ مار مار کر باہر نکال دیا اور اپنے دوست کے پاس آ کر سو گیا۔

صبح ہوتے ہوتے منشیوں، چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی اس کے بعد موتی کی مرمت ہوئی اور اسے بھی موٹی سی رسی سے باندھ دیا۔

ایک ہفتہ تک دونوں بیل وہاں بندھے پڑے رہے۔ خدا جانے اس کانجی ہاؤس کے آدمی کیسے بے درد تھے کہ کسی نے چارے کا ایک تنکا تک نہ ڈالا۔ ہاں ایک مرتبہ پانی دکھا دیا جاتا تھا۔ ہڈیاں نکل آئیں۔

ایک دن باڑے کے سامنے ڈگڈگی بجنے لگی اور دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو گئے۔ تب دونوں بیل نکالے گئے اور ان کی دیکھ بھال ہونے لگی لوگ آ آ کر ان کی صورت دیکھتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ایسے نیم جان بیلوں کو کون خریدتا۔

معاً ایک آدمی جس کی آنکھیں سرخ تھیں اور جس کے چہرے پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے۔ آیا اور منشی جی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی شکل دیکھ کر کسی نامعلوم احساس سے دونوں بیل اٹھے۔ وہ کون ہے اور انہیں کیوں خریدتا ہے۔ اس کے متعلق انہیں کوئی شبہ نہ رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

ہیرا ''گیا کے گھر سے ناحق بھاگے۔ اب جان نہ بچے گی۔''

موتی نے جواب دیا۔ بھگوان سب پر مہربانی کرتے ہیں۔ انہیں ہماری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا۔"

ہیرا" بھگوان کے لئے ہمارا جینا مرنا دونوں برابر ہے۔"

چلو اچھا ہے کچھ دن اس کے پاس رہیں گے۔

ایک مرتبہ بھگوان نے اس سے لڑکی کے روپ میں بچایا تھا۔ کیا بھگوان ہمیں اب نہ بچائیں گے۔

موتی" یہ آدھی چھری چلائے گا۔ دیکھ لینا۔"

ہیرا" معمولی بات ہے مر کر ان دکھوں سے چھوٹ جائیں گے؟"

نیلام ہو جانے کے بعد دونوں بیل اس آدمی کے ساتھ چلے دونوں کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بچارے پاؤں تک نہ اٹھا سکتے تھے مگر ڈر کے مارے چلے جاتے تھے۔ ذرا بھی آہستہ چلتے تو وہ ڈنڈا جما دیتا تھا۔

راہ میں گائے بیلوں کا ایک ریوڑ مرغزار میں پھرتا نظر آیا۔ سبھی جانور خوش تھے۔ کوئی اُچھلتا تھا، کوئی بیٹھا جگالی کرتا تھا۔ کیسی پر مسرت زندگی تھی ان کی۔ لیکن کیسے بے غرض تھے کسی کو ان کی پرواہ نہ تھی کسی کو خیال نہ تھا کہ ان کے دو بھائی موت کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔

معاً انہیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ راستہ دیکھا ہوا ہے۔ ہاں ادھر ہی سے تو گیا ان کو اپنے گاؤں لے گیا تھا۔ وہی کھیت، وہی باغ، وہی گاؤں ہے۔ اب ان کی رفتار تیز ہونے لگی۔ ساری تکان، ساری کمزوری، ساری مایوسی دفع ہوگئی۔ ارے یہ تو اپنا کھیت آگیا۔ یہ اپنا کنواں ہے جہاں ہر روز پانی پیا کرتے تھے۔

موتی: "ہمارا گھر نزدیک آگیا ہے۔"

ہیرا: "بھگوان کی مہربانی ہے۔"

موتی: ''میں تو اب گھر کو بھاگتا ہوں۔''

ہیرا: ''یہ جانے بھی دے گا اتنا سوچ لو۔''

موتی: ''اسے میں مار گراتا ہوں جب تک سنبھلے تب تک ہم گھر پہنچ جائیں گے۔''

ہیرا: ''نہیں دوڑ کر تھان تک چلو۔ وہاں سے آگے نہ چلیں گے۔''

دونوں مست ہو کر بچھڑوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوئے گھر کی طرف دوڑے اور اپنے تھان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے دوڑا آ رہا تھا۔ جھوری اپنے دروازے پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا اور انہیں پیار کرنے لگا۔ بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اس آدمی نے بیلوں کی رسیاں پکڑ لیں۔

جھوری نے کہا یہ بیل میرے ہیں۔

تمہارے کیسے ہیں میں نے انہیں نیلام میں لیا ہے۔

جھوری نے کہا میرا خیال ہے چرا کے چپکے سے لائے ہو چلے جاؤ میرے بیل ہیں۔ میں بیچوں گا تو بکیں گے۔ کسی کو میرے بیل بیچنے کا کیا حق ہے۔

میں نے تو خریدے ہیں۔ وہ بولا۔

خریدے ہوں گے۔ جھوری نے کہا۔

اس پر وہ آدمی زبردستی بیلوں کو لے جانے کے لئے آگے بڑھا۔ اسی وقت موتی نے سینگ چلایا۔ وہ آدمی پیچھے ہٹا۔ موتی نے تعاقب کیا اور اسے کھدیڑتا ہوا گاؤں سے باہر تک لے گیا اور تب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

وہ آدمی دور کھڑا دھمکیاں دیتا تھا۔ پتھر پھینکتا تھا اور موتی اس کا راستہ روکے ہوا تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

جب آدمی ہار کر چلا گیا تو موتی اکڑتا ہوا لوٹ آیا۔

ہیرا: ''میں ڈر رہا تھا کہیں تم اسے مار نہ بیٹھو۔''

موتی: ''نزدیک آتا تو ضرور مارتا۔''

ہیرا: ''اب نہ آئے گا۔''

موتی: ''تو دور ہی سے خبر لونگا۔ دیکھوں کیسے لے جاتا ہے۔''

ذرا دیر بعد ناند میں کھلی، بھوسہ، چوکر، دانہ سب کچھ بھر دیا گیا دونوں بیل کھانے لگے۔ جھوری کھڑا ان کی طرف دیکھتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔

بیسیوں لڑکے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ سارا گاؤں مسکراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت مالکن نے آکر اپنے بیلوں کے ماتھے چوم لئے۔

منشی پریم چند نے بیلوں کی تشبیہ دے کر یہ نہیں بتایا کہ یہ بات کن کے لئے نصیحت ہے۔ کیونکہ ان دنوں کا دور آزادی کی جدوجہد کا دور کہا جاتا ہے۔ جب یہ کہانی مصنف نے لکھی ہوگئی تو کیا پتہ کہ ان دِنوں فرقہ وارانہ فسادات یا دوسرے نسلی فسادات ملک میں ابھر رہے ہوں۔

اسی لئے اس کہانی کو دو بیلوں کی تشبیہ دے کر نصیحت دی ہے جیسے کہ ایک بیل کی چمتکاری بھی دکھائی ہے جو کہ بہت سے حیوانوں کو رہا کرتا ہے۔ کانجی ہاؤس میں ان دونوں حیوانوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرتے تھے۔ کیونکہ بہت سے پالتو حیوان جب مالک کے بغیر بھاگ جاتے تو ان کو کانجی ہاؤس میں بند کیا جاتا تھا۔ پھر مالک ان کی تلاش میں وہاں سے ان حیوانوں کو جرمانہ وصول کرنے کے بعد گھیر لیتے تھے۔

اب ہم نے منشی پریم چند کے تین افسانے اور ایک کہانی پڑھی۔ پڑھ کر اپنے طریقے سے کچھ تنقید بھی کی لیکن اردو زبان میں بہت سے تنقید نگار موجود ہیں۔ اپنی قلم کا زور اور چھاپ الگ الگ ہوتی ہے۔ اسی لئے کسی حد تک میری تنقید کا مواد ٹھیک ہے یا غلط ہے وہ محقق ہی طے کر سکتے ہیں۔

غربت کا جال

(منشی پریم چند کے افسانے "کفن" سے)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا جا دیکھ تو آ"

مادھو درد ناک لہجے میں بولا "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں۔"

"تو بڑا بے درد ہے بے۔ سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وفائی۔"

"تو مجھ سے اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین

دن آرام ۔ مادھوا تنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لئے انہیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہوتو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے ۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی ۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔

محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا ۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبط نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی ۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی ۔ عجیب زندگی تھی ان لوگوں کی ۔ گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں ۔

پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے ، دنیا کے مکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے ۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں ۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے ۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے آلو یا مٹر اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے ۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔

مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی ۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی ۔ پسائی کر کے ، گھاس چھیل کر بھی وہ سیر بھر آٹے کا انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی ۔ جب سے وہ آئی یہ

دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا" جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی۔ چڑیل کا پھنساؤ ہوگا اور کیا۔ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے؟"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھری میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ بولا" مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم ہوتا تھا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا۔ اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کیلئے کافی سامان تھا۔ اسلئے دونوں جلدی جلدی نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

ہم اوپر لکھے ہوئے منشی پریم چند کے افسانے کو نئے طرز کا افسانہ تصور کر سکتے ہیں۔ اگر چہ اوپر دیئے ہوئے وضاحت کو ہم افسانے کے انداز میں لکھیں گے تو پھر میرے خیال میں اس کا عنوان "غربت کا جال" موافق رہے گا۔ اسی لئے میں نے اوپر تشبیہ سطر پر عنوان لکھا ہے۔

کفن کے بدلے شراب

(منشی پریم چند کے افسانے سے)

''بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے۔ پھونکیں ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔''
''لیکن لوگوں کو جواب کیا دیں گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کہ کفن کہاں ہے''
گھیسو ہنسا ''کہہ دیں گے کہ روپیہ کمر سے کھسک گیا۔ بہت ڈھونڈا ملا نہیں۔''
مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔
''بڑی اچھی تھی بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔''
آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہوگئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپیہ خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچے تھے۔
دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا، نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ ہماری آتما

پرسن ہورہی ہے تو کیا اسے پُن نہ ہوگا۔"

مادھو نے فرطِ عیدت جھکا کر تصدیق کی "جرور سے جرور ہوگا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بے کنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اُسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

"کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟"

"کہیں گے تمہارا سر"

"پوچھے گی تو جرور"

"تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کپھن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال کیا دنیا میں گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دینگے۔

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے۔"

گھیسو تیز ہو گیا "میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا۔ تو مانتا کیوں نہیں۔"

"کون دے گا۔ بتاتے کیوں نہیں۔"

گھیسو نے سمجھایا "کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی، جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلد مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھکاوے ٹھگنی

سارا میخانہ محوِ تماشہ تھا اور یہ دونوں مے کش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

اوپر مذکورہ واقعہ منشی پریم چند کا افسانہ ''کفن'' سے لیا گیا ہے جب ہم اس کہانی یا افسانے کو پڑھتے ہیں تو ہمیں اس بات کا پورا احساس ہوتا ہے کہ یہ کہانی بھی افسانہ تصور کی جائے گی۔ اسی لئے میں نے اس افسانے کا عنوان ''کفن کے بدلے شراب'' تجویز کیا ہے۔ اب محققوں کی رائے کیا ہوگی اسکا فیصلہ وہ خود کریں گے۔

امانت میں خیانت نہیں

(منشی پریم چند کے افسانے ''زیور کا ڈبہ'' سے ماخوذ)

بی اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکارش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ ان کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اسّی سالہ والد بھی چل بسے اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدے پر تھے ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی مگر وہ سب دھری رہ گئی۔ اور اب گزر اوقات کے لئے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی۔ والد نے کوئی جائیداد نہ چھوڑی۔ الٹا بھوک کا بوجھ اور سر پر لاد دیا۔ اور بیوی بھی ملی تو تعلیم یافتہ، شوقین، زبان کی طرارہ جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مرجانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو تیس روپئے کی نوکری کرتے شرم آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لئے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیئے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ پختہ، ہوادار اور ضروری سامان سے آراستہ۔ ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف دو گھنٹے کا تھا۔ لڑکا تو لگ بھگ انہیں کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن، کام چور، ابھی نویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی

بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ اپنا ہی لڑکا سمجھتے تھے۔ گویا ملازم نہیں گھر کا آدمی تھا اور گھر کے ہر ایک معاملہ میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ پرکاش نے اپنے شاگرد ویراندر کو پڑھا کر چلنے کے لئے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا ''ابھی نہ جاؤ بیٹا، ذرا میرے ساتھ آؤ، تم سے کچھ کہنا ہے
پرکاش نے دل میں سوچا۔ وہ کیا بات ہے جو ویراندر کے سامنے نہیں کہی جاسکتی،
پرکاش کو علیحدہ لے جاکر اومادیوی نے کہا ''تمہاری کیا صلاح ہے، ویرو کا بیاہ کردوں؟
ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے۔
پرکاش نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ تو ویرو بابو ہی سے پوچھئے''
''نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔''
پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا۔ ''میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔
ان کا بیسواں سال تو ہے لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔''
''تو ابھی نہ کروں، تمہاری یہی صلاح ہے۔''
''جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں۔ میں نے تو دونوں باتیں عرض کردیں۔''
''تو کر ڈالوں؟ مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے پھر پچھتانا پڑے گا۔
کیوں؟''
''میرے رہتے ہوئے تو آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ہاں مرضی ہو تو کر ڈالئے، کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔''
''سب تیاریاں تمہیں کرنی پڑیں گی۔ یہ سمجھ لو۔''
''تو میں کب انکار کرتا ہوں۔''
روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے جو انہیں

تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے۔ پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہوگئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے جنہیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہوں میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہیں تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار منیجر بن بیٹھا ہے۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے۔

میں غیر نہیں ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں۔ اگر سو دو سو کی کوئی چیز دے دیتے تو کون سی بڑی بات تھی۔ مگر اہل ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے۔ اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لئے جگہ ہی نہیں رہتی۔"

رات کے بارہ بج گئے ہیں پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آتی۔ بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ بادل گھر آئے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی ہے۔ یکا یک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آ گیا۔ یہی تو کھانے پینے کی عمر ہے اور اس عمر میں اس بچاری کو ہر ایک چیز کے لئے ترسنا پڑتا ہے۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا تھا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس چھت سے ملی ہوئی تھی۔ بیچ میں ایک پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اُتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا پہلے زینہ سے اتر کر کمرہ میں چلوں۔ اگر وہ جاگ گئے تو زور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا۔ کیا چونکا دیا۔ کہہ دوں گا میرے گھر کی چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا اس لئے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کر رہا ہے۔

کسی کو مجھ پر شک ہی نہیں ہوگا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں۔ سب نوکروں پر شک کریں گے۔ میں بھی کہوں گا صاحب نوکروں کی حرکت ہے۔ اس کے سوا اور کون لے جاسکتا ہے۔ میں تلوہ نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد کوئی دوسرا گھر لے لوں گا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ گزرے۔ پھر بھی وہ جب زینہ سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

چمپا نے کہا ''چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی۔ چور کچھ دیکھ کر ہی جان خطرے میں ڈالتے ہیں۔ یہاں کیا رکھا ہے؟''

پرکاش نے غصہ میں کہا ''کچھ نہیں ہے برتن تو ہیں۔ غریب کے لئے تو اپنی ہنڈیا ہی سب کچھ ہے۔''

ایک دن چمپا نے کمرہ میں جھاڑو لگائی تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا۔

''صندوق تم نے ہٹایا تھا؟''

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی۔ جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں اِدھر اُدھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی ''میں کیوں ہٹانے لگی؟''

''پھر کس نے ہٹایا؟''

''میں نہیں جانتی''

''گھر میں تم رہتی ہو تو جانے کون؟''

''اچھا اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔''

''کچھ یوں ہی پوچھتا تھا۔''

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں دیکھ نہ لے پرکاش کو چین کہاں چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی۔ وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی

تھیں، پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں۔ پرکاش کو پکوڑیاں پسند بھی بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے لگی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر اسے بہلانے کے لئے بولا "طشتری میں کیا لائیں؟ آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔ اچھی پکوڑیاں ہیں۔"

آج چمپا کے دل میں شبہ کا وہ اکھوا جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لئے اس کا دل بیقرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا تھا۔ چمپا کو وہ تالی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آنکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خرید لی اور صندوق کھول ڈالا۔ ارے یہ تو زیور ہیں۔ اس نے ایک زیور نکال کر دیکھا، یہ کہاں سے آگئے۔ مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔ معاً اس کے دل میں خیال گذرا یہ زیورات ٹھاکر صاحب کے تو نہیں، چیزیں وہی تھیں جن کا تذکرہ کرتے رہتے تھے اسے اب کوئی شک نہیں رہا۔ لیکن اتنی بڑی شرم وندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے ایک دم صندوق بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ان کی اتنی ہمت کیسے پڑی؟ یہ کمینی خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لئے انہیں تنگ نہیں کیا۔ اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں۔ چوری کے زیوروں کیلئے ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا؟

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے وہ محبت نہ رہی۔ نہ وہ عزت کا جذبہ، بات بات پر تکرار ہو جاتی۔ پہلے دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہتے تھے مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے، آپس میں ہمدردی تھی، مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے شہر کے ایک بینک میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اوکاؤنٹینٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ نقد دس ہزار روپیہ کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے؟ پرکاش تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک روز ٹھاکر صاحب سے اس معاملے پر بات چیت چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا۔ ''تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟''

پرکاش نے سر جھکا کر کہا'' دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپئے کہاں رکھے ہیں؟''

''اجی درخواست تو دو۔ اگر اور سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کی فکر نہ کرو۔''

پرکاش نے حیران ہو کر کہا'' آپ ضمانت داخل کر دیں گے؟''

''ہاں ہاں یہ کونسی سے بڑی بات ہے؟''

کئی روز گزر گئے۔ پرکاش کو بینک میں ملازمت مل گئی۔ اس تقریب میں اس کے یہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب، ان کی اہلیہ ویرا اندر اور اس کی نئی دلہن آئے ہوئے ہیں، باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا'' آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا۔ دادا میں اس وقت نہ جانے دوں گا چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی۔ چارپائیاں نہیں ہیں، بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے۔ رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدے میں۔ تینوں عورتیں اندر کمرہ میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا

ہوا تھا۔ پرکاش نے گچھا اٹھا لیا۔ پھر کمرہ کھول کر اس میں سے زیورات کا ڈبہ نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کیساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھر تھرا رہے تھے۔ لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا۔ آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا حرارت سے اضطراب اور خلش سے پر اب بخار کا اتار تھا سکون، فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا۔ تب قدم پیچھے ہٹا تھا، آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویرو کا کمرہ کھولا اور اندر جا کر ٹھاکر صاحب کے پلنگ ک نیچے ڈبہ رکھ دیا پھر فوراً باہر آ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ پڑا۔ ہنومان جی سنجیونی بوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اٹھائے جس روحانی سرور کا لطف اٹھا رہے تھے ویسی ہی خوشی پرکاش کو بھی ہو رہی تھی۔ زیوروں کو اپنے گھر لے جاتے ہوئے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی۔ گویا کہ کسی گہرائی، اتھاہ گہرائی میں گرا جا رہا ہو۔ آج ڈبہ کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایروپلین پر بیٹھا ہوا فضا میں اڑا جا رہا ہے اوپر، اوپر اور اوپر۔

وہ گھر پہنچا تو ویرو سویا ہوا تھا۔ چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا۔ دیکھنا چاہتا تھا وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔

ویراندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔ ماسٹر جی کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی۔ جو زیورات چوری ہو گئے تھے سب مل گئے۔

ٹھاکر صاحب بھی آ گئے اور بولے۔ "بڑی مبارک دعوت تھی تمہاری۔ زیور کا ڈبہ پورا مل گیا۔ ایک چیز بھی نہیں گئی۔ جیسے امانت رکھنے کیلئے ہی لے گیا ہو۔"

پرکاش کو ان باتوں پر یقین کیسے آئے جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔
کہیں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ چوری کیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔

ڈبہ کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا۔ تعجب کی بات ہے۔ میری عقل تو کام نہیں کرتی۔

ٹھاکر: کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی تمہاری ہی کیوں۔ ویرو کی ماں تو کہتی ہے کہ کوئی غیبی معجزہ ہے معجزات پر یقین ہو گیا۔

پرکاش: اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔

ٹھاکر: آج اس خوشی میں ہمارے یہاں دعوت ہوگی۔

پرکاش: آپ نے کوئی منتر ونتر تو نہیں پڑھوالیا تھا کسی سے......

ٹھاکر: کئی پنڈتوں سے۔

پرکاش: تو بس اس کی برکت ہے۔

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خوش خبری سنائی۔ وہ دوڑ کر اس کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا ''آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے''

''میں بھی ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔''

''تم تو سینکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو۔''

''مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہوگا۔''

پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''

اوپر لکھا ہوا واقعہ منشی پریم چند کے افسانہ ''زیور کا ڈبہ'' سے ماخوذ ہے۔ لیکن اگر میں کوئی دوسرا عنوان مناسب سمجھوں تو وہ ہوگا ''امانت میں خیانت نہیں''۔

اپنی ماں بلکہ پرائی ماں

(منشی پریم چند کے افسانے ''حج اکبر'' سے ماخوذ)

اتفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں ذرا دیر ہوگئی۔ وہاں دو کنجڑنوں میں بڑے جوش وخروش سے مناظرہ ہو رہا تھا۔ ان کی مصور طرز ادا، ان کا اشتعال انگیز استدلال، ان کی مشکل تضحیک۔ ان کی روشن شہادتیں اور منور روایتیں، ان کی تعریض اور تردید سب بے مثال تھیں۔ زہر کے دو دریا تھے یا دو شعلے جو دونوں طرف سے اُمڈ کر باہم گتھ گئے تھے۔ کیا روانی زبان تھی۔ گویا کوزے میں دریا بھرا ہوا۔ ان کا جوش اظہار ایک دوسرے کے بیانات کو سننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی، تخیل کی ایسی نوعیت، اسلوب کی ایسی جدت، مضامین کی ایسی آمد، تشبیہات کی ایسی موزونیت اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون شاعر ہے جو رشک نہ کرتا۔ صفت یہ تھی کہ اس مباحثہ میں تلخی یا دل آزاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دونوں بلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت ان کا ضبط، ان کا اطمینان سب حیرت انگیز تھا۔ ان کے ظرف دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدرجہا زیادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی۔ الغرض یہ خالص دماغی، ذہنی مناظرہ تھا۔ اپنے اپنے کمالات کے اظہار کے لئے ایک

خالص زور آزمائی تھی اپنے اپنے کرتب اور فن کے جوہر دکھانے کے لئے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ وہ مبتذل کنایات واشارے جن پر بے شرمی کو شرم آتی وہ کلمات رکیک جن سے عفونت بھی دور بھاگتی ہزاروں رنگین مزاجوں کے لئے محض وقت کا مطلق احساس نہ ہوا۔ اچانک نو بجنے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا۔ وہ لپکی ہوئی گھر کی طرف چلی۔

شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی۔ کیا بازار میں کھو گئی تھیں؟ دایہ نے خطاوارانہ انداز سے سر جھکا لیا۔ اور بولی۔ بی بی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہوگئی اور باتیں کرنے لگی۔

شاکرہ جواب سے اور بھی برہم ہوئی۔ یہاں دفتر جانے کو دیر ہورہی ہے۔ تمہیں سیر سپاٹے کی سوجھی ہے۔ مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھی۔

بچہ کو گود میں لینے چلی پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا "رہنے دو تمہارے بغیر بے حال نہیں ہوا جاتا۔

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی۔ بیگم صاحبہ کا غصہ فرو کرنے کی اس سے زیادہ کارگر کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی۔ اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ دایہ نے اسے گود میں اٹھا لیا اور دروازہ کی طرف چلی لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی "تمہارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں یہ تماشے کسی اور کو دکھایئے۔ یہاں طبیعت سیر ہوگئی۔"

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان ایسا مضبوط تعلق تھا جسے معمولی ترشیاں کمزور نہ کرسکتی تھیں۔ اسی وجہ سے شاکرہ کی سخت زبانیوں کا اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ واقعی

مجھے نکالنے پر آمادہ ہے۔ پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے رُخی سے کہیں اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھینا کہ دایہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بولی

''بی بی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔ بہت ہوگا تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہوگی۔ اس پر آپ جتنا جھلا رہی ہیں صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا دروازہ دیکھو۔ اللہ نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی دے گا۔ مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے۔

شاکرہ: تو یہاں تمہاری کون پرواہ کرتا ہے۔ تمہاری جیسی ماما ئیں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

دایہ: ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ ماما ئیں دائیاں بہت ملیں گی۔ جو کچھ خطا ہوئی ہو، معاف کیجئے گا۔ بس جاتی ہوں۔

شاکرہ: جا کر مردانے میں اپنا حساب کرلو۔

دایہ: میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائیاں منگوا دیجئے گا۔

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آگئے۔ پوچھا ''کیا ہے؟''

دایہ: کچھ نہیں بی بی نے جواب دے دیا ہے۔ گھر جاتی ہوں۔

صابر حسین خانگی تر درات سے ایسے بچتے تھے۔ جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچے۔ انہیں سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا پر کانٹوں پر پیر رکھنے کی جرأت نہ تھی۔ چیں بہ جبیں ہو کر بولے ''کیا بات ہوئی؟''

شاکرہ: کچھ نہیں، جی نہیں چاہتا ہے اسکور کھنے کا۔ کسی کے ہاتھوں بک تو نہیں گئے۔

صابر: تمہیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سوجتی رہتی ہے۔

شاکرہ: ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے۔ کیا کروں؟ خصلت ہی ایسی ہے۔ تمہیں یہ بہت پیاری ہے تو جا کر گلے باندھو۔ میرے یہاں ضرورت نہیں ہے۔

دایہ گھر سے نکلی تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں۔ دل نصیر کے لئے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچے کو گود میں لے کر پیار کرلوں۔ پر یہ حسرت لئے اسے گھر سے نکلنا پڑا۔

صابر: نہیں معاف کرو۔ مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں ہے۔ نہ جانے تمہارے منہ سے کیا نکل جائے کہ وہ آئی بھی ہو تو نہ آئے۔

شاکرہ نے شوہر کی طرف نگاہ ملامت سے دیکھ کر کہا۔ ''ہاں اور کیا! مجھے اپنے بچے کی بیماری کا قلق تھوڑے ہی ہے۔ میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اسے کب کی منا لائی ہوتی۔ وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو لیکن نصیر سے اسے محبت تھی۔ میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی، اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کردوں گی اور جس طرح راضی ہوگی، اسے راضی کروں گی۔''

شاکرہ نے بہت ضبط کر کے یہ باتیں کہیں مگر امڈے ہوئے آنسو اب نہ رک سکے۔ صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہو کر بولے۔ ''میں تمہارا جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں خود ہی جاتا ہوں۔''

عباسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب درخت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے ساری پتیاں گرادیں۔ بادحوادث نے درخت کو پامال کردیا اور اب یہی سوکھی ٹہنی ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پا کر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری ہری پتیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جو اب تک خشک اور پامال تھی۔ اس میں پھر رنگ و بو کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اندھیرے بیاباں میں بھٹکتے ہوئے مسافر کو شمع کی ایک جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اب اس کا جوئے حیات سنگ ریزوں سے نہ ٹکراتا تھا۔ وہ اب ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا۔ اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی۔ اس میں معنی پیدا

ہو گئے تھے۔

عباسی نصیر کی بھولی بھولی باتوں پر نثار ہوگئی مگر وہ اپنی محبت کو شاکرہ سے چھپاتی تھی۔ اس لئے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو۔ وہ نصیر کے لئے ماں سے چھپا کر مٹھائیاں لاتی اور اسے کھلا کر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو دو تین تین بار اسے ابٹن ملتی کہ بچہ خوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی کہ بچے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچے کی کم خوری کا رونا رویا کرتی اور اسے نظر بد سے بچانے کے لئے تعویذ اور گنڈے لاتی رہتی۔ یہ اس کی خالص مادرانہ محبت تھی۔ جس میں اپنی روحانی احتجاج کے سوا کوئی غرض نہ تھی۔

اس گھر سے نکل کر آج عباسی کی وہ حالت ہوگئی جو تھیٹر میں یکا یک بجلی کے گل ہو جانے سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی، کانوں میں وہی پیاری پیاری باتیں گونج رہی تھیں۔ اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ اس کال کوٹھری میں دم گھٹا جاتا تھا۔

رات جوں توں کر کے کٹی۔ صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی۔ یکا یک تازے حلوے کی صدا سن کر بے اختیار باہر نکل آئی۔ معاً یاد آ گیا آج حلوہ کون کھائے گا؟ آج گود میں بیٹھ کر کون چہکے گا۔ وہ نغمہ مسرت سننے کے لئے جو حلوہ کھاتے وقت نصیر کی آنکھوں سے ہونٹوں سے اور جسم کے ایک ایک عضو سے برستا تھا۔ عباسی کی روح تڑپ اٹھی۔ وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں نصیر کو دیکھ آؤں پر آدھے راستہ سے لوٹ آئی۔

نصیر عباسی کے دھیان سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ اترتا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی۔ معلوم ہوتا نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسیوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی۔ اس کے گھر کوئی آتا تو نصیر ہی کا ذکر کرتی نصیر اس کے

دل اور جان میں بسا ہوا تھا۔ شاکرہ کی بے رخی اور بدسلوکی کے ملال کے لئے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی اس لئے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی۔ گھر سے چلتی لیکن کبھی آدھے راستہ سے لوٹ آتی کبھی دو چار قدم سے آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون سا منہ لے کر جاؤں؟ جو محبت کو فریب سمجھتا ہو اسے کونسا منہ دکھاؤں۔ کبھی سوچتی کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو! بچوں کی محبت کا اعتبار کیا؟ نئی دایہ سے رچ گیا ہو۔ یہ خیال اس کے پیروں پر زنجیر کا کام کر جاتا تھا۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ عباسی کا دل ہر دم اچاٹ رہتا۔ جیسے کوئی لمبا سفر اسے درپیش ہو۔ گھر کی چیزیں جہاں کی تہاں پڑی رہتیں۔ نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ بدنی ضروریات بھی خلاء دل کو پر کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اسی اثناء میں حج کے دن آ گئے۔ محلّہ میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے۔ عباسی کی حالت اس وقت پالتو چڑیا کی سی تھی جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشہ کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے تئیں بھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا۔ آمادہ سفر ہو گئی۔

یکا یک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لئے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا۔ ان کا چہرہ اترا ہو تھا اور کپڑے تر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے گئے۔ عباسی محض یہ دکھانے کے لئے کہ میں بھی حج کرنے جا رہی ہوں، گاڑی سے باہر نکل آئی۔ صابر حسین اسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے اور بولے "کیوں عباسی! تم بھی حج کو چلیں؟"

عباسی نے فخریہ انکسار سے کہا "ہاں یہاں کیا کروں؟ زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ خدا کے یہاں منہ دکھانے کے لئے بھی تو کوئی سامان چاہیئے۔ نصیر میاں تو اچھی طرح ہیں؟"

صابر: اب تو تم جا رہی ہو۔ نصیر کا حال پوچھ کر کیا کرو گی۔ اس لئے دعا کرتی رہنا۔

عباسی کا سینہ ڈھر کنے لگا۔ گھبرا کر بولی ''کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے؟''
صابر: اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے۔ جس دن تم وہاں سے نکلیں۔ کوئی دو ہفتہ تک توانا انا کی رٹ لگاتا رہا اور اب ایک ہفتہ سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ ساری دوائیں کر کے ہار گیا۔ کوئی فائدہ ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا چل کر تمہاری منت سماجت کر کے لے چلوں۔ کیا جانے تمہیں دیکھ کر اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے۔ لیکن تمہارے گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ تم حج کرنے جارہی ہو۔ اب کس منہ سے چلنے کو کہوں۔ تمہارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھا کیا تھا کہ اتنی جرأت کر سکوں اور پھر کار ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے۔ جاؤ اس کا خدا حافظ ہے۔ حیات باقی ہے تو صحت ہو ہی جائے گی ورنہ مشیت ایزدی سے کیا چارہ؟''
عباسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ دل سے دعا نکلی ''اللہ میری جان کے صدقے میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو۔'' رقت سے گلا بھر آیا۔ ''میں کیسی سنگ دل ہوں۔ پیارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو گیا اور میں اسے دیکھنے تک نہ گئی۔ شاکرہ بدمزاج سہی، بدزبان سہی۔ نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا۔ یا خدا میرا گناہ بخشیو! پیارا نصیر میرے لئے ہڑک رہا ہے۔ (اس خیال سے عباسی کا کلیجہ مسوس اٹھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے) مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبت ہے ورنہ شاکرہ کی جوتیاں کھاتی اور گھر سے قدم نہ نکالتی۔ آہ! نہ معلوم بچارے کی کیا حالت ہے۔'' انداز وحشت سے بولی۔

''دودھ تو پیتے ہیں نا!''

صابر: تم دودھ پینے کو کہتی ہو۔ اس نے دو دن سے آنکھیں تو کھولی نہیں۔

عباسی: یا میرے اللہ! ارے اوقلی! بیٹا! آ کے میرا اسباب گاڑی سے اتار دے۔

اب مجھے جج وج کی نہیں سوجھتی۔ ہاں بیٹا جلدی کر۔ میاں! دیکھئے کوئی یکہ ہو تو ٹھیک کر لیجئے۔"

یکہ روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عباسی بار بار جھنجھلاتی تھی اور یکہ بان سے کہتی تھی "بیٹا جلدی کر میں تجھے کچھ زیادہ دیدوں گی" راستہ میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اسے غصہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا گھوڑے کے پر لگ جاتے۔ لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آ گیا تو عباسی کا سینہ زور سے اچھلنے لگا سر تیورا گیا۔ بار بار دل سے دعا نکلنے لگی۔ سب خیر و عافیت ہو۔
یکہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔ دفعتاً عباسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ سر تیورا گیا۔ معلوم ہوا دریا میں ڈوبی جاتی ہوں۔ جی چاہا یکہ سے کود پڑوں۔ مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا کہ عورت میکے سے وداع ہو رہی ہے۔ تسکین ہوئی۔

آخر صابر حسین کا مکان آ پہنچا۔ عباسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھوکا پیاسا گھر آئے اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔ دروازہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ باورچی بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ عباسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولٹس پکا رہی ہے۔ کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی تو اس کا دل گرما کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔ شاکرہ نصیر کو گود میں لیے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔ غم اور یاس کی زندہ تصویر۔
عباسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ نصیر کو اس کی گود سے لے لیا اور اس کے منہ کی طرف چشم پرنم سے دیکھ کر کہا "بیٹا نصیر آنکھیں کھولو!"
نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا۔ تب یکایک دایہ

کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا "انا آئی۔ انا آئی"

نصیر کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جائے ایسا معلوم ہوا گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔ صابر حسین نے آ کر اسے گود میں اٹھالیا اور پیار کر کے بولے "تمہاری انا کو مار بھگادیں؟ نصیر نے منہ بنا کر کہا "نہیں روئے گی۔"

عباسی بولی "کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا؟"

صابر حسین نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ملیگا۔ اس حج کا نام حج اکبر ہے۔"

"حج اکبر" افسانہ جو کہ منشی پریم چند جی نے لکھا ہے ان کی تصنیف سے ہم متفق ہیں لیکن عنوان کے تحت ہمیں شکوہ بھی ہے۔ اگر مصنف کا اپنا خیال اور ردعمل تا ابد ادبی دنیا میں موجود رہے گا۔ لیکن پھر بھی میں اپنی سمجھ سے اس افسانے کا عنوان "اپنی ماں بلکہ پرائی ماں" تجویز کرتا ہوں۔ کیونکہ کبھی کبھی بچہ اپنی حقیقی ماں سے زیادہ پالنے والی ماں یعنی دایہ سے زیادہ محبت والفت کا اظہار کرتا ہے، یہ فطری چیز ہے۔ افسانہ نگاروں کی رائے یا خیال جو کچھ بھی ہو لیکن میں نے اپنی رائے ادب نواز دوستوں تک پہنچادی ہے۔

موتی کا دم ہیرے کو غم
دونوں رہے تا ابد ہمدم

(منشی پریم چند کی کہانی ''دو بیل'' سے ماخوذ)

لیکن گدھے کا بھائی اور بھی ہے جو اس سے کچھ ہی کم گدھا ہے اور وہ بیل ہے۔ جن معنوں میں ہم گدھے کا لفظ استعمال کرتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بیل کو بے وقوفوں کا سردار کہنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارا خیال ایسا نہیں ہے بیل کبھی کبھی اڑیل بھی دیکھنے میں آتے ہیں اور کبھی کبھی کئی طریقوں سے وہ اپنی پسندیدگی اور ناراضی کا اظہار بھی کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اس کا درجہ گدھے سے نیچا ہے۔

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے ایک کا نام ہیرا تھا۔ دوسرے کا موتی دونوں بچھائیں نسل کے تھے۔ دیکھنے میں خوبصورت کام چوکس۔ ڈیل ڈول میں اونچے، بہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے تھے۔ دونوں میں محبت سی ہوگئی تھی۔ دونوں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھے خاموش زبان میں ایک دوسرے سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کیونکر سمجھ جاتے تھے یہ ہم نہیں

کہہ سکتے۔ ضرور ان میں کوئی نا قابل فہم قوت تھی جس کے سمجھنے سے اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی انسان محروم ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ کر اور سونگھ کر اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے کبھی کبھی دونوں سنگیں ملا لیا کرتے تھے۔ عناد سے نہیں محض زندہ دلی سے ہنسی مذاق سے جیسے یار دوستوں میں بھی کبھی ڈھول دھپا ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر دوستی کچھ پھیکی سی اور ہلکی سی رہتی ہے۔ جس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جس وقت یہ دونوں بیل ہل یا گاڑی میں جوتے جوتے اور گردنیں ہلا ہلا کر چلتے تو ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ زیادہ بوجھ میری ہی گردن پر رہے۔ کام کے بعد دوپہر یا شام کو کھلتے تو ایک دوسرے کو چوم چاٹ کر اپنی تکان اتار لیتے۔ ناند میں کھلی بھوسہ پڑ جانے کے بعد دونوں ایک ساتھ اٹھتے ایک ساتھ ناند میں منہ ڈالتے اور ایک ہی ساتھ بیٹھتے۔ ایک منہ ہٹا لیتا تو دوسرا بھی ہٹا لیتا۔

ایک بار جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لئے اپنی سسرال بھیجے بیلوں کو کیا معلوم وہ کیوں بھیجے جاتے ہیں؟ سمجھے مالک نے ہمیں بیچ دیا کون جانے بیلوں کو اپنا بیچا جانا پسند آیا یا نہیں۔ لیکن جھوری کے سالے کو انہیں اپنے گاؤں تک لے جانے میں دانتوں میں پسینہ آ گیا۔ پیچھے سے ہانکتا تو دونوں دائیں بائیں بھاگتے آگے سے پکڑ کر کھینچتا تو دونوں پیچھے کو زور لگاتے مارتا تو دونوں سینگ نیچے کر کے پھنکارتے۔ اگر ان بے زبانوں کی زبان ہوتی تو جھوری سے پوچھتے تم نے ہم غریبوں کو کیوں نکال دیا۔ ہم نے تمہاری خدمت کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اتنی محنت سے کام نہ چلتا تھا اور کام لیتے تو ہم کو انکار نہ تھا۔ ہمیں تمہاری خدمت میں مر جانا بھی قبول تھا۔ ہم نے کبھی دانے چارے کی شکایت نہیں کی۔ تم نے جو کچھ کھلایا سر جھکا کر کھایا۔ پھر تم نے ہمیں اس ظالم کے ہاتھ کیوں بیچ دیا۔

شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گاؤں جا پہنچے۔ دن بھر کے بھوکے تھے لیکن

جب ناند میں لگائے گئے تو کسی نے بھی اس میں منہ نہ ڈالا۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا جسے انہوں نے اپنا گھر سمجھا تھا وہ آج ان سے چھوٹ گیا۔ یہ نیا گھر نیا گاؤں نئے آدمی......سب انہیں بیگانے سے لگتے تھے۔ دونوں نے چپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا اور لیٹ گئے۔ جب گاؤں میں سونا پڑا تو دونوں نے زور مار کر پگھے تاڑ لئے اور گھر کی طرف چلے۔ پگھے بہت مضبوط تھے کسی کو شبہ بھی نہ ہوسکتا تھا کہ بیل انہیں توڑ سکیں گے پر ان دونوں میں اس وقت دگنی طاقت آ گئی تھی۔ ایک جھٹکے میں رسیاں ٹوٹ گئیں۔

جھوری نے صبح اٹھ کر دیکھا دونوں بیل چرنی میں کھڑے تھے۔ دونوں کی گردنوں میں آدھا آدھا رسا لٹک رہا تھا۔ گھٹنوں تک پاؤں کیچڑ سے بھر ہوئے تھے اور دونوں کی آنکھوں میں محبت کی ناراضی جھلک رہی تھی۔ جھوری ان کو دیکھ کر محبت سے باؤلا ہوگیا اور دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔

انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہایت دلکش تھا۔

گھر اور گاؤں کے لڑکے جمع ہو گئے اور تالیاں بجا بجا کر ان کا خیر مقدم کرنے لگے۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا نہ تھا مگر اہم ضرور تھا۔ بال سبھا نے فیصلہ کیا کہ دونوں بہادروں کو ایڈریس دیا جائے۔ کوئی اپنے گھر سے روٹیاں لایا۔ کوئی گڑ کوئی بھوسی۔

ایک لڑکے نے کہا ''ایسے بیل کسی کے پاس نہ ہوں گے۔''

دوسرے نے تائید کی ''اتنی دور سے دونوں اکیلے چلے آئے۔''

تیسرا بولا ''پچھلے جنم میں ضرور آدمی ہوں گے۔''

اس کی تردید کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ سب نے کہا ''ہاں بھئی ضرور ہوں گے۔''

جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازہ پر دیکھا تو جل اٹھی بولی

کیسے نمک حرام بیل ہیں۔ایک دن بھی وہاں کام نہ کیا۔بھاگ کھڑے ہوئے۔
جھوری اپنے بیلوں پر یہ الزام برداشت نہ کر سکا بولا ''نمک حرام کیوں ہیں؟ چارہ دانہ نہ دیا ہوگا۔تو کیا کرتے!۔''

دوسرے دن دونوں دوست کانجی ہاؤس میں بند تھے۔
ان کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ سارا دن گزر گیا اور کھانے کو ایک تنکا بھی نہ ملا۔سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ یہ کیسا مالک ہے۔

وہاں کئی بھینسیں تھیں، کئی بکریاں، کئی گھوڑے، کئی گدھے مگر چارہ کسی کے سامنے نہ تھا سب زمین پر مردے کی طرح پڑے تھے۔کئی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔سارے دن دونوں دوست دروازے کی طرف دیکھتے رہے مگر کوئی چارہ لے کر نہ آیا۔غریبوں نے دیوار کی نمکین مٹی چاٹنی شروع کی مگر اس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی۔

رات کو بھی جب کھانا نہ ملا تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوئے۔
موتی سے بولا ''مجھے تو معلوم ہوتا ہے جان نکل رہی ہے۔''
موتی ''اتنی جلدی ہمت نہ ہارو بھائی! یہاں سے بھاگنے کا کوئی طریقہ سوچو؟''
ہیرا ''آؤ دیوار توڑ ڈالیں؟''
موتی ''مجھ سے تو اب کچھ نہ ہوگا؟''
ہیرا ''اسی بوتے پر اکڑتے تھے؟''
موتی ''ساری عقل نکل گئی بھائی!''

باڑے کی دیوار کچی تھی۔ہیرا نے اپنے نوکیلے سینگ دیوار میں گاڑ دیئے اور زور مارا تو مٹی کا چپڑ نکل آیا۔اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔اس نے دوڑ دوڑ کر دیوار سے ٹکریں ماریں۔ہر ٹکر میں تھوڑی مٹی گرنے لگی۔''

اتنے میں کانجی کا چوکیدار لالٹین لے کر جانوروں کی حاضری لینے آ نکلا۔ ہیرا کی یہ وحشت دیکھ کر اس نے اسے کئی ڈنڈے رسید کئے اور موٹی سے رسی سے باندھ دیا۔ موتی نے پڑے پڑے اس کی طرف دیکھا۔ گویا زبان حال سے کہا ''آخر مار کھائی۔ کیا ملا؟''

ہیرا ''زور تو آزما لیا۔''

موتی ''ایسا زور کس کام کا اور بندھن میں پڑ گئے۔''

ہیرا ''اس سے باز نہ آؤں گا خواہ بندھن پڑتے جائیں۔''

موتی ''جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے''

ہیرا ''اس کی مجھے پرواہ نہیں ہے۔ یوں بھی تو مرنا ہے ذرا سوچو اگر دیوار گر جاتی تو کتنی جانیں بچ جاتیں۔ اتنے بھائی یہاں بند ہیں کسی کے جسم میں جان ہی نہیں ہے۔ دو چار دن اور یہی حال رہا تو سب مر جائیں گے۔

موتی ''ہاں یہ بات ہے تو میں بھی زور لگاتا ہوں۔''

موتی نے بھی دیوار میں ٹکریں ماریں۔ تھوڑی سی مٹی گری اور ہمت بڑھی تو دیوار میں سینگ لگا کر اس طرح زور کرنے لگا جیسے کسی سے لڑ رہا ہو۔ آخر دو گھنٹہ کی قوت آزمائی کے بعد دیوار کا کچھ حصہ گر گیا۔ اس نے دوگنی طاقت سے دوسرا دھکا لگایا تو آدھی دیوار گر پڑی۔

دیوار کا گرنا تھا کہ نیم جان جانور اٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں گھوڑیاں بھاگ نکلیں بھیڑ بکریاں نکلیں۔ اس کے بعد بھینسیں بھی کھسک گئیں پر گدھے ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔

ہیرا نے پوچھا ''تم کیوں نہیں بھاگ جاتے؟''

ایک گدھے نے کہا ''کہیں پھر پکڑ لئے جائیں تو......؟''

ہیرا ''پکڑ لئے جاؤ تو اس وقت دیکھا جائے۔ اس وقت تو موقع ہے۔''

گدھا ''ہمیں ڈر لگتا ہے ہم نہ بھا گئیں گے۔''

آدھی رات گزر چکی تھی۔ دونوں گدھے کھڑے سوچ رہے تھے بھاگیں یا نہ بھاگیں موتی اپنے دوست کی رسی کاٹنے میں مصروف تھا۔ جب وہ ہار گیا تو ہیرا نے کہا ''تم جاؤ مجھے یہیں رہنے دو۔ شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔''

موتی نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا ''تم مجھے اتنا خود غرض سمجھتے ہو ہیرا؟ ہم اور تم اتنے دونوں سے ساتھ رہے۔ آج تم مصیبت میں پھنسے تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں''

ہیرا ''بہت مار پڑے گی۔ سمجھ جائیں گے یہ تمہاری شرارت ہے۔''

موتی ''جس قصور کیلئے تمہارے گلے میں رسہ پڑا ہے اس کے لئے اگر مجھ پر مار پڑے تو کیا بات ہے۔ اتنا تو ہو گیا کہ دس جانوروں کی جان بچ گئی!''

یہ کہہ کر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ مار مار کر باہر نکال دیا اور اپنے دوست کے پاس آ کر سو گیا۔

صبح ہوتے ہوتے منشیوں، چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی اس کے بعد موتی کی مرمت ہوئی اور اسے بھی موٹی سی رسی سے باندھ دیا۔

ایک ہفتہ تک دونوں بیل وہاں بندھے پڑے رہے۔ خدا جانے اس کانجی ہاؤس کے آدمی کیسے بے درد تھے کہ کسی نے چارے کا ایک تنکا تک نہ ڈالا۔ ہاں ایک مرتبہ پانی دکھا دیا جاتا تھا۔ ہڈیاں نکل آئیں۔

ایک دن باڑے کے سامنے ڈگڈگی بجنے لگی اور دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو گئے۔ تب دونوں بیل نکالے گئے اور ان کی دیکھ بھال ہونے لگی لوگ آ آ کر ان کی صورت دیکھتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ ایسے نیم جان بیلوں کو کون خریدتا۔

معاً ایک آدمی جس کی آنکھیں سرخ تھیں اور جس کے چہرے پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے۔ آیا اور منشی جی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی شکل دیکھ کر کسی نامعلوم احساس

سے دونوں بیل اٹھے۔ وہ کون ہے اور انہیں کیوں خریدتا ہے۔ اس کے متعلق انہیں کوئی شبہ نہ رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

ہیرا" گیا کے گھر سے ناحق بھاگے۔ اب جان نہ بچے گی۔"

موتی نے جواب دیا۔ بھگوان سب پر مہربانی کرتے ہیں۔ انہیں ہماری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا۔"

ہیرا" بھگوان کے لئے ہمارا جینا مرنا دونوں برابر ہے۔"

چلو اچھا ہے کچھ دن اس کے پاس رہیں گے۔

ایک مرتبہ بھگوان نے اسے لڑکی کے روپ میں بچایا تھا۔ کیا بھگوان ہمیں اب نہ بچائیں گے۔

موتی" یہ آدھی چھری چلائے گا۔ دیکھ لینا۔"

ہیرا" معمولی بات ہے مگر ان دکھوں سے چھوٹ جائیں گے؟"

نیلام ہو جانے کے بعد دونوں بیل اس آدمی کے ساتھ چلے دونوں کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بچارے پاؤں تک نہ اٹھا سکتے تھے مگر ڈر کے مارے چلے جاتے تھے۔ ذرا بھی آہستہ چلتے تو وہ ڈنڈا جما دیتا تھا۔

راہ میں گائے بیلوں کا ایک ریوڑ مرغزار میں پھرتا نظر آیا۔ سبھی جانور خوش تھے۔ کوئی اُچھلتا تھا، کوئی بیٹھا جگالی کرتا تھا۔ کیسی پر مسرت زندگی تھی ان کی، لیکن کیسے بے غرض تھے کسی کو ان کی پرواہ نہ تھی کسی کو خیال نہ تھا کہ ان کے دو بھائی موت کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔

معاً انہیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ راستہ دیکھا ہوا ہے۔ ہاں ادھر ہی سے تو گیا ان کو اپنے گاؤں لے گیا تھا۔ وہی کھیت وہی باغ ہیں، وہی گاؤں، اب ان کی رفتار تیز ہونے لگی، ساری تکان، ساری کمزوری، ساری مایوسی رفع ہوگئی۔ ارے یہ تو اپنا کھیت

آ گیا۔ یہ اپنا کنواں ہے جہاں ہر روز پانی پیا کرتے تھے۔

موتی: ''ہمارا گھر نزدیک آ گیا ہے۔''

ہیرا: ''بھگوان کی مہربانی ہے۔''

موتی: ''میں تو اب گھر کو بھاگتا ہوں۔''

ہیرا: ''یہ جانے بھی دے گا اتنا سوچ لو۔''

موتی: ''اسے میں مار گراتا ہوں جب تک سنبھلے تب تک ہم گھر پہنچ جائیں گے۔''

ہیرا: ''نہیں دوڑ کر تھان تک چلو۔ وہاں سے آگے نہ چلیں گے۔''

دونوں مست ہو کر بچھڑوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوئے گھر کی طرف دوڑے اور اپنے تھان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے دوڑا آ رہا تھا۔ جھوری اپنے دروازے پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا اور انہیں پیار کرنے لگا۔ بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

اس آدمی نے بیلوں کی رسیاں پکڑ لیں۔

جھوری نے کہا یہ بیل میرے ہیں۔

تمہارے کیسے ہیں میں نے انہیں نیلام میں لیا ہے۔

جھوری نے کہا میرا خیال ہے چرا کے چپکے سے لائے ہو چلے جاؤ میرے بیل ہیں۔ میں بیچوں گا تو بکیں گے۔ کسی کو میرے بیل بیچنے کا کیا حق ہے۔

میں نے تو خریدے ہیں۔ وہ بولا۔

خریدے ہوں گے۔ جھوری نے کہا۔

اس پر وہ آدمی زبردستی بیلوں کو لے جانے کے لئے آگے بڑھا۔ اسی وقت موتی نے سینگ چلایا۔ وہ آدمی پیچھے ہٹا۔ موتی نے تعاقب کیا اور اسے کھدیڑتا ہوا گاؤں سے باہر تک لے گیا اور تب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

وہ آدمی دور کھڑا دھمکیاں دیتا تھا۔ پتھر پھینکتا تھا اور موتی اس کا راستہ روکے ہوا تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

جب آدمی ہار کر چلا گیا تو موتی اکڑتا ہوا لوٹ آیا۔

ہیرا: ''میں ڈر رہا تھا کہیں تم اسے مار نہ بیٹھو۔''

موتی: ''نزدیک آتا تو ضرور مارتا۔''

ہیرا: ''اب نہ آئے گا۔''

موتی: ''تو دور ہی سے خبر لونگا۔ دیکھوں کیسے لے جاتا ہے۔''

ذرا دیر بعد ناند میں کھلی، بھوسہ، چوکر، دانہ سب کچھ بھر دیا گیا دونوں بیل کھانے لگے۔ جھوری کھڑا ان کی طرف دیکھتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔

بیسیوں لڑکے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ سارا گاؤں مسکراتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت مالکن نے آکر اپنے بیلوں کے ماتھے چوم لئے۔

منشی پریم چند نے چند افسانوں اور کہانیوں پر کچھ خاص روشنی ڈالی ہے اور کچھ خاص باتیں بتائیں۔ مگر منشی پریم چند کی ایک کہانی جس کا عنوان ''دو بیل'' ہے، میں نے اس کا عنوان کیوں بدلا۔ وہ اس وجہ سے کہ منشی پریم چند نے ابتداء میں یہ لکھا ہے کہ بیل اور گدھے ایک ہی درجہ میں رکھا ہے لیکن خود مصنف نے دو بیلوں کی کہانی میں بیل کے کارنامے بہت ہی اچھے دیکھائے ہیں۔ جس کی وجہ سے میں یہ تسلیم نہیں کرت کہ بیل ایک بیوقوف حیوان سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم کسی حیوان کو بلا کسی وجہ کے ڈانٹتے ہیں تو وہ ہم پر ضرور بھڑکے گا۔ خیر منشی پریم چند نے اس افسانے میں خود موتی کے کارنامے لوگوں کے سامنے اور پڑھنے والوں کے سامنے رکھ کر خود مان لیا کہ ان حیوانوں کو بے وقوف نہیں سمجھنا چاہئے۔ جبکہ مصنف نے ان دو حیوانوں کی تشبیہ انسانی ناموں سے دی ہے۔ وہ ہے موتی اور ہیرا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ حیوان

انسانوں کے مانند ایک دوسرے کے لئے ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے میں نے اس کہانی کا عنوان بدل ڈالا۔ اب افسانہ نگاروں اور تنقید نگاروں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے تاثرات پیش کریں۔

میں نے منشی پریم چند کے بارے میں کچھ افسانوں پر اپنی رائے دے دی۔ پہلے پہل عنوان میں ہی یہ کہا کہ "منشی پریم چند کے مختلف تہہ خانے"۔

اب ہمیں یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ اردو ادب میں منشی پریم چند کے افسانے ادب کے تہہ خانے تسلیم کئے جا سکتے ہیں جیسے کہ میں نے پہلے بھی کئی افسانوں میں یہ وضاحت کی کہ منشی پریم چند نے اپنی قلم سے جو بھی افسانے لکھے ہیں اس میں تواریخ اور آج کل کی روایت کے مطابق دلیل موصول ہوتی ہے۔ جب ہم ان افسانوں کو پڑھتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ شاید ابھی ادیب نے یہ بات فرمائی ہے۔ لگتا ہے کہ زمانہ حال میں مصنف ہمارے ساتھ ہے اور جیسے کہ وہ ابھی ماحول کا جائزہ لے کر یہ باتیں کہہ رہا ہے۔

منشی پریم چند کے افسانوں کو میں نے نئے انداز سے سوچ کر ایک نیا عنوان دیا۔ یہ بات یقینی ہے کہ ان کے افسانوں میں ادبی تہہ خانہ تا ابد موجود ہے اور موجود رہے گا۔ اب ان تنقید نگاروں اور محققوں پر منحصر ہے کہ وہ کیا رائے دیتے ہیں۔



کرشن چندر اُردو ادب

اُردو ادب میں بہت سے افسانہ نگار ہیں لیکن اُن میں ایک اہم افسانہ نگار اور قلمکار کرشن چندر کا بھی ذکر کرنا لازمی ہے۔ کرشن چندر نے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ جن میں سے اُن کا ایک افسانہ ''حسن اور حیوان'' ہے جسے ادبی حلقے میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

ہم نے اُردو ادب میں بہت سے افسانے پڑھے جن میں دلیل اور وضاحت کی کثرت موجود ہوتی ہے۔ جسے ادبی اصولوں کے ذیل میں زیادہ پسند نہیں کیا گیا۔ یعنی اگر ادیب یا افسانہ نگار سیدھی سادھی بات یا دلیل کو ادبی لہجہ کے بغیر بار بار دہراتا ہے تو وہ اس دلیل یا بات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر کئی ہنرمند افسانہ نگار جب کوئی افسانہ یا کہانی اس نہج پر لکھتے ہیں تو پڑھنے والوں کو کثیر معلومات حاصل ہوتی ہے اور انکا ادبی ذوق وشوق دوبالا ہو جاتا ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں میں یہی خاص بات ملحوظ ہے۔ جیسے کہ وہ اپنے افسانہ ''حسن اور حیوان'' میں بغیر کسی دلیل کے وضاحت پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

ا۔ افسانے میں آمد سحر

سحر کی اڑتی، گھلتی ہوئی سیاہی اور سفیدی میں وہ ایک چھوٹے سے نالے کے قریب پہنچ گیا اور اپنے کپڑے اتار کر ننگ دھڑنگ نالے میں گھس گیا۔ پانی ایک دو جگہ اتنا گہرا تھا کہ کمر تک آتا تھا، پاؤں کہیں کومل، ملائم ریت اور کہیں نیلے نیلے پتھروں پر پھسلتے معلوم ہوتے تھے۔ شوخ وشنگ مچھلیاں اپنے نقرئی دھڑوں کو ہلاتی ہوئی اِدھر اُدھر گھومتی جاتی تھیں۔ کئی پتھروں پر اودی سبز یا سیاہ کائی جمی ہوئی تھی اور جب نہاتے نہاتے غیر ارادی طور پر اس کے پاؤں اُن پتھروں سے جا لگتے تو اس کے بدن کے روئیں روئیں میں ایک خاص قسم کی جنسی لذت کا احساس جاگ اٹھتا اور وہ مسرور ہو کر منہ میں پانی بھر کر زور زور سے غلو غلو غلو کرتا اور کلیوں کے چھوٹے چھوٹے فوارے چھوڑتا، ہنستا، گاتا، پانی میں ناچتا اور دونوں ہاتھوں سے چھینٹے اڑاتا، جیسے اس کے سامنے اس کا گہرا دوست یا محبوب کھڑا ہو۔

۲۔ کیکڑے کے اثرات مچھلی پر

جب وہ چلا تو کیکڑے نے ایک مچھلی کو پکڑ لیا اور اب وہ اپنی چینی آنکھوں سے اپنے شکار کی طرف پر مسرت نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

۳۔ پہاڑی کی تعریف

وہ پہاڑی پر انجیر کے درخت کے تنے سے سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ اس درخت کے سامنے انجیر کا ایک اور درخت تھا۔ نیچے ایک تلہٹی تھی جہاں دو چھوٹے چھوٹے کھیتوں

میں مکئی کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ اُن کے پرے بنج کی باڑھ تھی اور اُس سے پرے وہی نیلا آسمان اور اُس میں مری کے سلسلہ ہائے کوہ اور اُن کے سینے کو چیرتی ہوئی سڑک۔ اُس نے اِس منظر کی طرف دیکھتے دیکھتے یہ معلوم کر لیا کہ یہ سارا منظر نقلی تھا۔ آسمان کی نیلی سطح پر کسی نامعلوم مصور نے یہ چند آڑے ترچھے نقوش کھینچ دیئے تھے۔ ان میں جان بالکل نہ تھی۔ نہ رعنائی نہ خوبصورتی۔

۴۔ حیوانوں کے اثرات اور ان کا کام

پگڈنڈی کا رنگ زرد تھا۔ کناروں پر سبز گھاس سرنگوں تھی۔ کہیں کہیں جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے لیکن مرجھائے سے۔ جیسے سفر کی تکان سے چور ہو گئے ہوں، جیسے انہیں پیاس لگی ہو اور انہیں پانی دینے والا کوئی موجود نہ ہو۔ وہ آگے بڑھتا گیا اور اس کی پیاس چمک اٹھی۔ پگڈنڈی اب ایک اونچے کھیت کی مینڈ کے نیچے گذر رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایک نازک اندام بکری کھیت کی مینڈ پر چرتی نظر آئی۔ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور بکری نے سر اٹھا کر ایک نگاہ غلط انداز سے اس کی طرف دیکھا اور پھر "اُوں ہوں میں میں" کر کے منہ پھیر لیا جیسے کہہ رہی ہو "میں آگے بڑھوں، یہاں کوئی پانی وانی نہیں، میرے تھنوں میں جو دودھ ہے۔

۵۔ کھانے پینے کا ڈھنگ

مکئی کی روٹی اسے معلوم تھا اس قدر خشک ہوتی ہے کہ دہن کا لعاب اسے تر کر کے حلق کے نیچے گزارنے کے لئے ناکافی ہوتا ہے۔ اسی لئے تو بار بار پانی پیا جاتا ہے جب سالن موجود نہ ہو تو پانی ہی بہترین سالن ہوتا ہے۔ ایک ہزار سال کی معاشی وتمدنی ترقی کے بعد بھی انسانی تہذیب اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی تھی کہ انسانوں کی

بیشتر آبادی کو خشک روٹی اور پانی مہیا کرا سکے۔ خشک روٹی اور پانی اور خچروں کی طرح چلتے ہوئے جبڑے اور بے نور آنکھیں۔ اُس نے چپڑی ہوئی لچکیلی گیہوں کی روٹی پر مربہ لگاتے ہوئے سوچا کہ وہ آج اس درختوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہوئے کسانوں کو مکھن اچار اور مربہ بانٹ کر ہزاروں سالوں کی روایت کو توڑ دے گا۔ پھر اس نے سوچا کہ اسے ابھی پندرہ میل اور سفر کرنا ہے اور بہر حال ہزاروں سالوں کی بھوک مربے کے ایک چھوٹے ٹکڑے سے نہیں مٹائی جا سکتی۔

۶۔ نوجوان کسان کی محنت

نوجوان کسان کا چہرہ زمین سے لگتا جا رہا تھا۔ اس کے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ سب مسافر وہاں سے چل دیئے تھے لیکن اُس سے نجانے کیوں وہاں سے ہلا نہ جاتا تھا۔ اُس نے سوچا یہ کوئی پُر اسرار طاقت تھی جس نے اس نوجوان کسان کو یوں اذیت اٹھانے پر مجبور کر دیا اور یہ بنیا اس کسان کی تکلیف پر اس قدر مسرور تھا۔ یہ خچر کیوں اس قدر گھبرائی ہوئی نگاہ سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ یکا یک دو گلد میں ایک جھاڑی سے ایک ساتھ اڑیں اور خوشی سے چیخیں مارتی ہوئی فضا میں غائب ہو گئیں۔ یہ گلد میں اس نے سوچا ایک دوسرے کو اغوا کر لیجاتی ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں، ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں۔ لیکن اُن کی پشت پر کیوں کوئی پتھر نہیں رکھتا اور یہاں کیوں ہر اس انسان کے سینے پر پتھر کی سل رکھ دی جاتی ہے۔ جس کے سینے میں اپنے ہم نفس کے لئے محبت کی آگ روشن ہو اٹھے۔ یہ کیسا اندھیر ہے۔

۷۔ ڈوبتے ہوئے سورج کے اثرات

سورج چوٹی پر غروب ہو رہا تھا۔ جنگلی گلاب کی بیلوں کا سہارا لئے دو سونے کی

مورتیں اُس کی طرف تک رہی تھیں جھٹپٹے کے عالم کی خامشی میں اُس کے قریب سے گذرتی ہوئی ہوا اُداس معلوم ہوتی تھی۔ اُداس اور میٹھی، جیسے اس نے جنگلی پھولوں کی ڈنڈیوں کا سارا شہد باہر کھینچ لیا ہو۔ ساری فضا میں جنگلی گلاب کی خوشبو اور شفق کی رنگینی گھلتی ہوئی معلوم دیتی تھی۔ وہ کچھ عرصہ ایک جگہ کھڑا اُن کی طرف ٹکتا رہا پھر اُس نے بازو گھما کر انہیں سلام کیا اور راستے پر مڑ گیا۔



احمد شاہ پطرس بخاری کے
خطوط کہانیوں کیساتھ وابستہ ہو سکتے ہیں

پہلے زمانے میں تمام ادیب دوسرے ادیبوں کے ساتھ خط وکتاب کرتے تھے۔ جس سے ہمیں بہت ہی فائدہ ہوتا تھا۔ ہم ادیبوں کے حالات اور واقعات سے روشناس ہوتے تھے، ان دنوں مواصلات کے موافق انتظامات موجود نہیں تھے جتنے کہ موجودہ دور میں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے ادیب دوسرے ادیبوں کے ادب اور مسائل کے بارے میں خط وکتاب کرتے تھے۔ جب ہم ان خطوط کو پڑھتے تھے تو ہم کچھ الفاظ اور اسلوب کا ڈھنگ بھی سیکھتے تھے۔ ان خطوط پر بہت سارے ادیبوں نے کتابیں چھپوائیں۔ جیسے کہ غالبؔ کے دور میں غالب نے بہت سے خطوط لکھے جو کہ ''خطوطِ غالب'' کے نام سے آج تک مشہور ہے۔ جن کو پڑھ کر ہمیں غالبؔ کے

بارے میں تفصیل معلوم ہوتی ہے۔اسی طرح سے بہت سارے ادیبوں نے اپنے اپنے خطوط چھاپ کر پڑھنے والوں کو پیش کیئے۔

اسی طرح ہمارے مشہور نثر نگار، ناول نگار، تنقید نگار جناب احمد صاحب پطرس بخاری کے چھپے ہوئے خطوط بازار میں دستیاب ہیں۔لیکن جب ہم ان خطوط کا مجموعہ پڑھتے ہیں تو ہمیں سمجھ میں آتا ہے کہ ان خطوط میں زیادہ کچھ معلومات نہیں ہے۔ بخاری صاحب نے اپنے اکثر خطوط میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو روزمرہ کے حالات سے آگاہ کیا ہے۔غور سے ان خطوط کو پڑھنے پر ہم کو زبان کے معاملے میں اور دیگر حالات کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔ بخاری صاحب کی میٹھی زبان پڑھنے والوں کو بہت بھاتی ہے۔ بخاری صاحب اپنے روزمرہ کے حالات کے ساتھ ساتھ ہمیں تاریخی مناظر کا بھی علم فراہم کرتے ہیں۔زبان کے لحاظ سے لہجہ بہت ہی عمدہ ہے۔خطوط کے مطالعہ سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ بخاری صاحب اپنے فن خطوط نویسی کے ماہر ہیں۔جس کی وجہ سے اردو ادب میں انکو ایک اہم مقام حاصل ہے۔

بخاری صاحب کے خطوط کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خطوط افسانے کے طرز پر لکھے گئے ہیں جیسے کہ بخاری صاحب نے میزہ فیض کے نام (یہ خط فیض احمد فیض کی بچی کے نام ہے) لکھا ہے۔ہمیں اس خط کو پڑھنے پر اس بات سے متفق ہو جائینگے۔ملاحظہ فرمائیں۔

میزہ فیض کے نام

۳۰/واد یوئیرس نیو یارک
۲۰/نومبر ۱۹۵۸ء
پیاری میزہ

جب جی چاہے مجھے خط لکھنا مگر لکھنا ضرور اور دیکھو سب کو میری جانب سے ایک بار پھر پیار دینا۔ بھولنا مت۔

کیا کہوں یادِ نیو یارک

(افسانہ)

کافی عرصہ ہوا۔ تمہارا ۲۶/اگست کا خط ملا تھا۔ تم میری طویل خاموشی کے باعث جواب سے مایوس ہوگئی ہو تو حق بجانب ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ان دنوں میری صحت اچھی نہیں رہی۔ اِس کے باوجود مجھے کام کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے خط و کتاب کا سلسلہ بند رہا۔ اب میں تندرست ہوں اور تمہارا خط سامنے رکھ کر جواب لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔

میں تمہیں خط اپنے دفتر سے لکھ رہا ہوں۔ جو اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی عمارت میں دسویں منزل پر واقع ہے۔ اس عمارت کی اڑتیس منزلیں ہیں۔ ایک مستطیل سا مینار ہی سمجھو۔ دور سے دیکھو تو ایسی لگتی ہے جیسے ماچس کی ڈبیا اپنے کناروں پر کھڑی ہو۔ مطلع آج اتفاقاً نہایت صاف ہے۔ سورج کی روشنی کھڑکیوں میں سے اندر آرہی ہے۔ یہ کھڑکیاں دریا کی جانب کھلتی ہیں۔ جو اُوپر سے نظر آتا ہے۔ وہ دریائے ہڈسن کی ایک شاخ ہے۔ جو یہاں سے کچھ فاصلے پر بحر اوقیانوس میں گرتا ہے۔ یہاں دریائے ایسٹ کہتے

ہیں۔اس وقت جب میں لکھ رہا ہوں۔تو بی بڑی کشتیاں اور تیل کے بیڑے دریا میں تیرتے پھرتے ہیں۔پانی دھوپ میں چمک رہا ہے اور وہ نیچے کی طرف مجھے پلوں میں سے ایک پل نظر آرہا ہے۔جو دریائے ایسٹ پر باندھا گیا ہے۔اس پل کا نام ولیمز برگ ہے۔ویسے ان سب میں مشہور پل برک ہاٹن ہے۔یہ اتنا ہی مشہور ہے۔جتنا ہڈسن کی مغربی شاخ پر جارج واشنگٹن پل۔جس کی تصویر تم نے دیکھی ہوگی۔

موسم سرما کی آمد آمد ہے۔اگر چہ سردی ابھی بہت ہلکی ہے۔نیویارک شہر میں ابھی برف نہیں پڑی۔کہیں دسمبر کے آخر اور جنوری فروری میں پڑے گی۔یہاں خزاں کا موسم سب سے دلکش ہوتا ہے۔امریکی لوگ اسے "Fall" کہتے ہیں۔یہ ستمبر میں ہوتا ہے۔اس موسم میں درختوں کے پتے پہلے زرد اور پھر تانبے کی طرح سرخ ہوجاتے ہیں۔جنگلوں میں جیسے آگ سی لگ گئی ہو۔جہاں کہیں درخت اُگے ہوتے ہیں وہ جگہ بس رنگریز کا کارخانہ معلوم ہوتا ہے۔جیسے اس نے پیارے پیارے رنگوں میں کپڑے رنگ کر سوکھنے کے لئے پھیلا دیئے ہوں۔بڑی سڑک کے دونوں طرف دور دور تک قدرتی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔سڑک پر گاڑی چلانے میں بڑا لطف آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں ان گھنے جنگلوں میں بیٹھ کر تالابوں اور جھیلوں میں پڑے ہوئے آتشیں رنگ کے درختوں کے عکس کا نظارہ کیا جائے۔اس سال بھی فصل خزاں خوب رہی۔عام طور پر موسم خوشگوار رہا کئی روز تک جنگلوں میں گھوما جاسکتا ہے۔اور سیر کی جاسکتی تھی۔

جب تم نے مجھے خط لکھا تو تمہاری امی ولایت سے واپس آچکی تھیں۔اور ابا ابھی وہیں تھے۔اب تک تو وہ بھی لوٹ آئے ہوں گے۔انہیں میرا سلام کہنا اور چھیمی کو پیار دینا۔مجھے یہ بھی بتانا کہ تم نے تیرنا سیکھ لیا ہے یا نہیں۔اگر نہیں تو اس کی مشق کرتی رہو۔یہ ایک ایسی تفریح ہے جو حاصل نہ کی جائے تو زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے۔

تمہارا ہنڈ کلیا تو خوب چلتا ہوگا۔

اسی طرح سے بخاری صاحب نے دوسرا ایک خط سید امتیاز علی تاج کے نام لکھا۔ جس کو پڑھ کر پڑھنے والے کو خود محسوس ہوتا ہے کہ بخاری صاحب نے جیسے افسانے کے ڈھنگ سے چٹھی مرتب کی ہے۔ اگر چہ خط کا ہی مراسلہ ہم غور سے پڑھیں گے تو واضح طور پر خط ہی ہے لیکن اگر ہم اس خط کو افسانے کے لہجہ میں طرز بیان کرنے بیٹھیں گے تو صحیح طریقے سے پڑھنے والے افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں جیسے کہ

سید امتیاز علی تاج

۲؍نومبر　　　　خاکسار

ڈیئر امتیاز　　　　بخاری

کرسی کی خواہش

دسمبر کے آخر میں دو مہینے کی رخصت لوں گا۔ جو بیشتر دہلی میں اور باقی کسی پہاڑی مقام پر گذاروں گا۔ یکم مارچ کو پرنسپل گورنمنٹ کالج کا چارج لینا ہے۔

جوں جوں واپسی کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ دل میں عجب اُمنگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ہیجان کے اتنے سال تم سے وابستہ رہ کر گذارے ہیں کہ ہر اُمنگ کے ساتھ تم آپنے آپ ہی دل میں چلے آتے ہو۔ کبھی کبھی ڈرتا ہوں کہ نامعلوم اس درمیانی عرصہ میں طبیعتوں کی آب و ہوا بالکل ہی بدل نہ گئی ہو۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ جوانی کے علاقے اور رستے کبھی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور کبھی تن جاتے ہیں لیکن موت سے پہلے ٹوٹتے نہیں اور الحمد للہ کہ تم اور میں ابھی موت سے بہت دور ہیں۔ اس امید کی بنا پر لاہور آنے کے خیال سے بجز مسرت اور اطمینان کے کوئی جذبہ دل میں نہیں

اٹھتا۔ تابستان کی طویل دوپہر میں اور زمستان کی طویل راتیں اور احباب کی طویل پرزہ گوئیاں پھر یاد آتی ہیں۔

اب پڑھنے والے خود اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اِن خطوط کو کہانی کے میں لکھا گیا ہے۔ یعنی مصنف نے ان خطوط میں واقعات، تاریخی اور روزہ مرہ کے حالات نہایت ہی عمدہ انداز سے قلم بند کئے ہیں۔ اگر ہم کئی خطوط کو ترتیب سے لکھیں تو ایک کہانی کی شکل بھی دے سکتے ہیں۔

عنوان کے دائرے میں

پطرس بخاری کے مضامین

ہر ایک زبان کی مختلف تحریروں اور مختلف اندازے بیان نے پڑھنے والوں کو بہت سے مضامین پیش کیے ہیں۔ غور و خوض کرنے پر اس بات کا علم ہوگا کہ اردو زبان میں ایسے بہت سے نثر نگار موجود ہیں جن کا شمار دوسری زبان کے نثر نگاروں کے ساتھ بخوبی کر سکتے ہیں۔ نثر کی بہت سی اقسام ہیں۔ مثلاً اخباری نثر، مذہبی نثر، روایتی نثر اور روزمرہ کی نثر۔ اِن باتوں پر بحث کرنے سے معلوم ہوگا کہ اردو زبان میں نثر بہت ہی بہترین پائی جاتی ہے۔ جیسے اخباری نثر، ہم مختلف اخباروں میں روزمرّہ کے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ پڑھتے ہیں۔ مذہبی نثر میں مذہبی طور طریقے جو دائرہ قانون کے تحت ہی لکھا جاتے ہیں۔ گھریلو نثر میں ایسی با اخلاقی باتیں جو ہم اپنے گھروں میں آپس میں کرتے ہیں۔ گھریلو نثر پر بہت سے ادب نواز دوستوں نے بڑی تعداد میں کتابیں لکھی ہیں۔ اس طرح کے نثر کو پڑھ کر ہمارے ماحول کو تروتازگی ملتی ہے، سماجی حالات درست ہوتے ہیں اور ایک معیاری تہذیب جنم لیتی ہے۔

ہم ایسی شخصیت کی بات کرتے ہیں جو کہ اردو زبان کے بلند پایہ نثر نگار مانے

جاتے ہیں۔پطرس بخاری صاحب نے اُردو زبان میں بہت سے بہترین مضامین لکھیں ہیں۔

ہاسٹل میں پڑھنا (کتے)،اُردو کی آخری کتاب، مرید پور کا پیر، انجام بخیر، سینما کا عشق، میبل اور میں، مرحوم کی یاد اور لاہور کا جغرافیہ۔

یہ تمام مضامین بہت ہی بہترین انداز سے لکھے گئے ہیں۔الفاظ کی رنجش سے پاک، عمدہ اسلوب بیان، سادہ لہجہ اور قابل فہم مضامین لکھے ہیں۔لیکن جب یہ تمام مضامین ایک تنقید نگار کے دائرے میں آتے ہیں تو وہ اپنے فہم کے مطابق اپنی رائے پڑھنے والوں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔تنقید نگار کو مخالفت میں اور حق میں، دونوں ہی پہلوؤں کا سامنے رکھ کر لکھنا پڑتا ہے۔

میں نے یہ تمام مضامین پڑھے ہیں۔مجھے بہت ہی پسند آئے اِن میں مصنف نے بہت سے جدید الفاظ لکھیں ہیں۔سادہ اور سلیس الفاظ نے مضامین کو قابل فہم بنا دیا ہے۔جن سے میں بہت ہی متاثر ہوا۔فی الحال ہم پطرس بخاری کے مضامین ''ہاسٹل میں پڑھنا'' پر بحث ومباحثہ لکھتا ہوں۔

ا۔پہلے کالج کا داخلہ

مصنف نے یہ بات مضمون میں تحریر کی ہے کہ جب دسویں جماعت کے امتحان میں کامیاب ہوا تو تمام کے تمام رشتہ دار بہت ہی خوش ہوئے۔اُنہوں نے عید منائی، بہت لوگوں نے مٹھائیاں بانٹیں، میں بھی بحثیتِ طالب علم بہت ہی خوش رہا۔

۲۔امتحان میں کامیابی سے مالی امداد

دسویں جماعت میں کامیابی کے بعد حکومت کی طرف سے وظیفہ موصول ہوا۔ جس سے میرے رشتہ دار اور گھر والے بہت ہی خوش ہوئے۔

۳۔ کالج کے داخلے کے ساتھ ٹھہرنے کی جگہ

اکثر رشتہ داروں نے کالج کے داخلے کے بعد ہاسٹل میں رہنے کے لئے بہت ہی مخالفت کی۔ بہت سے رشتہ داروں نے کہا کہ ہاسٹل میں ٹھہرنے سے طالب علم بری صحبت میں مصروف رہتے ہیں۔ اور پڑھائی میں ناکامیاب ہوتے ہیں۔ اس طرح سے میری پڑھائی ہاسٹل کے باہر ہی رہی۔

۴۔ ہاسٹل میں ٹھہرنے کا شوق

اگر چہ طالب علم کو کوئی شوق ہوتا ہے تو وہ ہاسٹل میں ٹھہرنے کا شوق ہی ہوتا ہے۔ لیکن گھر سے اجازت نہ ملنے کی وجہ سے یہ شوق پورا نہ کر سکا۔ اس طرح سے میں اس شوق کے لئے بہت ہی شائق رہا، لیکن پورا ہی نہیں ہوا۔

۵۔ پوشاک پہننے کا ڈھنگ

مصنف اس مضمون میں کہتے ہیں کہ طالب علم لمبے بال رکھتے ہیں، مختلف قسم کی پوشاک پہن کر کالج میں جاتے ہیں۔ مصنف جس ماحول کا ذکر اپنے مضمون میں کیا ہے کافی حد تک آج کل کے ماحول کے عین مطابق ہی ہے۔

۶۔ پڑھائی کے کون کون سے مضامین

پطرس صاحب کہتے ہیں کہ دسویں کے امتحان کے بعد شوق رہا ریاضی مضمون پڑھنے کا، لیکن بہت سے کالج کے استادوں نے اِس کی مخالفت کی۔ لہٰذا ریاضی کا مضمون ہی نہیں پڑھا۔ فارسی کا مضمون بھی بہت ہی مشکل رہا۔

۷۔ ناکامیابی کا سامنا

مصنف اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ جب ایف اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے تو بی اے کا داخلہ ملا۔ لیکن افسوس رہا کہ بی اے کے امتحان میں ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب ہم بی اے کا امتحان میں ناکامیاب ہوئے تو ہم اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ ہمیں یہ یقین نہیں رہا کہ ہم امتحان میں ناکامیاب ہوجائیں گے۔ اسی لئے ہم نے گھر والوں کو اس بات پر امدادہ کیا کہ ہم ہاسٹل ہی میں آئندہ داخلہ لیکر پڑھیں گے۔ گھر والے بھی ہماری اس بات پر متفق ہوہے، پھر ہم نے ہاسٹل والوں کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور کئی طالب علموں کو یہ بات کہی کہ ہم ہاسٹل میں ٹھہریں گے۔

۸۔ امتحان کا نتیجہ

پطرس صاحب مضمون میں لکھتے ہیں کہ جب امتحان کا نتیجہ اخباروں میں چھپا تو ہم نے اپنا نتیجہ دیکھا اور ہم بی اے میں کامیاب ہوئے۔ نتیجہ دیکھ کر ہمیں خوشی بھی ہوئی اور غم بھی ہوا۔ غم اس بات کا ہوا کہ ہم طالب علمی کے دوران ہاسٹل کی زندگی ہی نہیں دیکھی۔ جب کہ ہم نے اس بات کا تہیہ کیا تھا کہ ہم ناکامیاب ہونے کے صورت میں ہاسٹل میں داخلہ لیں گے لیکن خدا کے فضل سے ہم کامیاب ہوئے اور ہمارے خیالات مسترد ہوئے۔

۹۔ طالب علم کی محنت

پطرس صاحب اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ ہمیں امتحان کا نتیجہ معلوم تھا کہ ہم کامیاب نہیں ہوں گے لیکن پھر بھی نتیجہ کامیاب ہی رہا۔ سال بھر کی پڑھائی میں محنت کرنے کے بعد ایک طالب علم کو اس بات کا پورا احساس ہوتا ہے کہ وہ کامیابی حاصل کرے گا یا ناکامیابی۔ اس بات کی وضاحت مصنف نے مکمل انداز سے اپنی تحریر میں نہیں لکھی۔ جس سے پطرس صاحب کا عنوان مسترد ہوسکتا ہے کیونکہ مصنف خود کہہ

رہا ہے کہ جب ہم (یعنی طالب علم گھر واپس چلے گئے تو ہمیں معلوم تھا کہ ہم بی اے فائنل میں کامیاب نہیں ہوں گے لیکن جب نتیجہ نکلا تو کامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔) جس سے طالب علم کو مسرت ہوئی۔ مصنف نے طالب علم کا جائزہ صحیح نہیں کیا، تحقیق نہیں کی کہ طالب علم کا دور کیسا ہوتا ہے۔ ایک طالب علم کو اپنی محنت کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں کئی محنت کرنے والے طالب علم ناکامیاب بھی ہوتے ہیں۔ وہ ایک یا دو نمبر کے فرق سے کسی مضمون میں ناکامیاب ہوجاتے ہیں۔ باقی مضامین میں اچھے نمبرات حاصل کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا بحث و مباحثے کے بعد میں یہ دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ مصنف نے مضمون کا عنوان صحیح نہیں لکھا ہے۔ اگر تنقید نگار اور پڑھنے والے میری بات متفق سے ہوں تو میرے لحاظ سے اس مضمون کا عنوان ''خیالی پلاؤ ہونا چاہئے'' کیونکہ مصنف نے اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ طلباء من گھڑت باتیں کرتے ہیں جسکے نتائج صحیح ثابت نہیں ہوتے۔ باقی مضمون کا حوالہ بہت ہی بہترین ہے۔ اپنی اپنی رائے اپنا اپنا خیال۔

خیر ہمیں پطرس صاحب کے مضمون پر بہت ہی ناز ہیں۔ ان کے تحریری تاثرات ادب میں تاابد موجود رہیں گے۔



سرسید احمد خان اور مولانا محمد حسین آزاد

کے دو مختلف مضمونوں پر ایک ہی عنوان

''دو راستے ایک مقام''

پہلے ہم سرسید احمد خان کے بارے میں تھوڑا سا تعارف ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ سرسید احمد خان ادبی میدان میں ایک قد آور شخصیت تسلیم کئے جاتے ہے۔ سرسید احمد خان اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ برصغیر میں ایک عظیم دانشور مانے جاتے ہے۔ سرسید احمد خان نے مسلمانوں میں انگریزی پڑھنے کی مہم چلائی۔ اُن کے دور میں مسلم انگریزی پڑھنے سے نفرت کرتے تھے۔ سرسید احمد خان نے انسانیت کے لئے ایک بہت ہی مفید کام کیا۔ سرسید احمد خان کے مضامین میں انسانیت سے ہمدردی، خلوص، اخوت اور غم خواری کا ذکر کثرت سے ملتا ہے جس کے پڑھنے والا بہت ہی

متاثر ہوتا ہے۔ سرسید احمد خان کے مضامین اعلیٰ درجہ کے خیالات لریز ہونے ہیں اور اِن خیالوں سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

سرسید احمد خان نے ادب وسماج کی خدمت کرتے ہوئے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی اپنی علمی خدمات سے مالا مال کیا۔ ہندوستان کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ سرسید احمد خاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ایک عظیم الشان اور معیاری تعلیمی ادارہ بنانے میں اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ جوکوئی بھی طالب علم اِس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتا ہے وہ سرسید احمد خان کو دعائیں مغفرت کرتا ہے۔

اب میں اِن کے مضمون ''گزرا ہوا زمانہ'' پر کچھ تاثرات بیان کرتا ہوں:

سرسید احمد خان نے اس مضمون میں بنی نو انسان کو یہ نصیحت دی ہے کہ اُسے انسانیت کا کردار بہترین انداز میں نبھانا چاہیئے، خواہ وہ کتنے ہی ظلم وستم دیکھے لیکن اس کو انسانیت کے اصولوں ہرگز ڈگمگانہ نہیں چاہیئے اور ایک حقیقت کا بھی ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے کہ جوانی عمر بھر نہیں رہے گی۔ جوانی کے بعد بوڑھاپہ کا بھی خیال تصور میں ضرور رکھنا چاہیئے۔

مصنف نے اپنے مضمون میں کہانی اس طرح بیان کی ہے۔

ایک لڑکا خواب دیکھتا ہے اور اس خواب میں گزرے ہوئے زمانے کی یاد آتی ہے۔ خواب میں یہ دیکھ رہا ہے کہ وہ خود بوڑھا ہے اور گھر میں اکیلا بیٹھا ہے۔ خوفناک رات، آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی ہے، زور وشور سے آندھی چل رہی ہے، بجلی کڑک رہی ہے ایسے حالات دیکھ کر ڈر لگ رہا ہے۔ پھر اپنے آپ کو غمگین محسوس کرتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ وہ ان حالات سے ڈرتا ہے بلکہ یہ محسوس کرتا ہے کہ شاید زندگی کی آخری رات ہے۔ اسی لئے سوچتا ہے کہ اس دنیا سے رخصت ہونا لازمی ہے۔ خواب دیکھتے دیکھتے اپنے گزرے ہوئے زمانے کے واقعات یاد کرتا ہے۔ جوانی اور بچپن کے دن یاد

کر کے وہ تازہ باتیں دُہراتا ہے جبکہ ماں باپ کا پیار اور روپیوں کی کوئی پرواہ ہی نہیں، کھانے پینے میں مٹھائی اور ریوڑی کی فکر ایک طرف رکھ کر ماں باپ کے پیارے کو دُہراتا رہا۔ مدرسے سے جلدی گھر کی طرف روانہ ہونا اب وقت نہ رہ کر افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

خواب دیکھتے دیکھتے جوانی کا دور یاد کر کے اپنی خوبصورتی پر ترستا ہے۔ جسم کی ہڈیاں بہت ہی مضبوط دیکھائی دیتی ہیں۔ محبت کے آنسو، صاف دانت اور دل میں اُمنگیں بھرپور محسوس کر رہا ہے۔ نئے ولولے اور جوش بھی موجود ہیں لیکن نا امید ہونے کی وجہ سے اب آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ گھر والے گھر میں جو نصیحت کرتے رہے اس کی طرف توجہ بالائے طاق رکھ کر اب پچھتانا محسوس کرتا ہے۔ مطلب خواب میں یہ دیکھ رہا ہے کہ بوڑھاپا آ ہی گیا اور وقت کو برباد کیا آندھی کا زور ہی نہیں تھم رہا۔

ان دوستوں، رشتہ داروں کو یاد کر کے خواب میں دہراتا ہے جن کے ساتھ اپنا بچپن گزارا۔ وقت بوقت نصیحت دے کر سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن مانا ہی نہیں۔ ان نصیحتوں پر عمل ہی نہیں کیا اب خواب میں پچھتا رہا ہے۔

خواب میں یہ محسوس کر رہا ہے کہ بچپن کا اپنا قیمتی وقت باتوں میں گزارا۔ بہت سے رشتے داروں کی نصیحت بالائے طاق رکھ کر بوڑھاپے کا منظر دیکھ کر پچھتا رہا ہے اور یہ محسوس کر رہا ہے کہ کوئی بھی تدبیر بوڑھاپا میں کارآمد نہیں ہے۔ ان باتوں سے گھبراہٹ محسوس ہوگئی۔

کھڑکی کھولی، رات بھر مست رہ کر گھبراہٹ محسوس ہوئی، کئی واقعات دیکھ کر گزرا ہوا زمانہ دماغ اور دل میں موجود رہا۔ کئی تصویریں دہرا کر نیند سے بیدار ہوا اب اس خواب سے نصیحت حاصل کر کے عمل کرنا چاہتا ہے۔ مطلب ایسے خواب کو دیکھ کر اب یہ سوچتا ہے کہ بوڑھاپا ضرور آنے والا ہے۔ مجھے بچپن میں ہی سب کام انجام دینے

تھے اور نیکی بھی ساتھ ساتھ نبھائی تھی تا کہ میں بوڑھاپے میں خواب کی طرح ذلیل وخوار نہ ہوں۔

مندرجہ بالا مختصر کہانی سر سید احمد خان کے مضمون سے اخذ کی ہے۔

اب سر سید احمد خان کے مضمون پر تنقید کچھ اس انداز سے کرتا ہوں۔ جو کہ مندرجہ ذیل میں درج ہے۔

دورِ فلک

مصنف ہمیں اس کہانی کے ذریعہ یہ پیغام پہنچانہ چاہتا ہے کہ اے انسان یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ دُنیا میں تم ہمیشہ رہو گے۔ بچپن جوانی اور بوڑھاپا سب ختم ہو جائیگا۔ آخر کار ہمیں اس دُنیا سے رخصت ہونا ہے۔ جوانی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ جوانی کے دور میں ہم گھمنڈ کرنے لگتے ہیں اور کسی کی مدد نہیں کرتے۔ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ گھمنڈ چند منٹوں کے بعد ختم ہونے والا ہے اور اس دور کے ختم ہونے پر جب بوڑھاپا آتا ہے پھر پچھتانے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دورِ فلک دفن ہوا اور بوڑھاپے کا دور دیکھ رہے ہیں۔ مصنف ان باتوں سے ہمیں احساس دِلاتا ہے کہ جوانی کے دور میں بوڑھاپے کا خیال بھی رکھنا چاہئے۔

واردات

سر سید احمد خان ”گزرا ہوا زمانہ“ مضمون میں ہمیں اِس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ انسان اپنی جوانی میں کوئی ایسا کام کرتا ہے جسے وہ بوڑھاپے میں یاد کرتا ہے۔ جب اُن کارناموں کا ذکر بوڑھاپے میں دُہراتا ہے۔ انسان کو ہمیشہ نیک کرنے چاہیے اور غلط کام کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ تا کہ وارِدات کا ذکر بوڑھاپے میں نہ آئے۔

خاکِ میں ملے

سرسید احمد خان اس مضمون میں وضاحت کرتے ہوئے ہمیں یہ نصیحت کرتے ہیں کہا اگر ہم کبھی بچپن میں اپنے والدین سے روٹھ جاتے تھے تو وہ ہمیں پیار سے مناتے تھے تاکہ ہم خوش رہیں۔ لیکن جب ایسے شخص ہم سے بچھڑ جاتے ہیں تو ہم یہ کہتے ہیں کہ کہاں رہا وہ پیار، کہاں رہی وہ دلبری آخر خاک میں ہی ملے۔

نمرود کے دم

سرسید احمد خان اپنے مضمون میں یہ بتاتے ہیں اے انسان آپ نے اپنے کام میں اپنے بھائی، بہن اور دوست آشناؤں کے تجربوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ جب تم اپنی ماں پر ناراض ہوتے ہو تو یہ باتیں یاد آتی ہیں۔ جب آپ کے والدین رحلت فرما جاتے ہیں تو یہ محسوس کرتے ہو کہ جو بھی کام انہوں نے انجام دئے خواہ وہ غلط رہے ہوں یا صحیح لیکن اچھائی ہی رہی نہ کہ نمرود کے دم۔

یادگار

جب آپ اپنی جوانی مایوسی میں بسر کرتے ہو جبکہ جوانی کے دور میں مایوسی بہت ہی بری ثابت ہوتی ہے۔ لیکن بری معاشی حالت ہونے کی وجہ سے مایوسی محسوس کرتے ہو اور کھڑکی کھول کر دیکھتے ہو کہ طوفان تھم گیا۔ یہ محسوس کرتے ہو کہ آسمان میں ابر نہیں نظر آتا ہے بلکہ آسمان صاف ہے تاریکی دور ہوگئی ہے۔ اس کی خوبصورتی دیکھ کر یہ کہہ رہے ہو یہ بھی ایک یادگار تصور کیا جائے گا۔ مطلب ہوا کہ زندگی میں غربت کا دور بھی آتا ہے اور امیری کا دور بھی آتا ہے پھر بھی انسان کو ایسے خیالات کو مدنظر رکھ کر یہ سوچنا چاہئے کہ جوانی اور بوڑھاپا ہمیشہ نہیں رہنے والے۔ جب کوئی چیز انسان کھوتا

ہے تو کھو کر پچھتاتا ہے اور پچھتاتے وقت یہ کہتا ہے کہ گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آتا۔

رنگ وہ رنگ نہیں

سر سید احمد خان بتاتے ہیں کہ جوانی کے دور میں انسان بہت ہی غلطیاں کرتا ہے۔اور اِن غلطیوں کا پچھتاوا بوڑھاپے میں محسوس کرتا ہے۔کوئی نیک اور اچھا کام نہیں کیا ہو اور صرف ذاتی مقصد کے لئے اچھے کام کئے ہوں۔سر سید احمد خان اس مضمون میں ہمیں اس بات کا اشارہ کر رہے ہیں کہ اگر ہم کسی کے لئے بھلائی کا کام کرتے ہیں تو ثواب حاصل ملتا ہے۔"رنگ وہ رنگ نہیں" کیونکہ جوانی ہمیشہ رہنے والی نہیں آخر جوانی مٹنے والی ہے۔

برائی کا بدلہ برائی ہے

سر سید احمد خان اپنے مضمون میں یہ فرماتے ہیں کہ جب کسی کی ماں محوِ خیال ہو اور اسی وقت اپنے لڑکے کی آواز سنے، تو وہ یہ آواز سن کر ماں اس کے قریب جا کر اسے پیار کریگی اور اس کی بھلائی کے لئے خدا سے دعا کریگی۔ماں کا یہ حسن سلوک اپنے لڑکے کے لئے ہمیشہ ہی رہتا ہے۔لیکن اگر لڑکے نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تو وہ اس کے لئے بہتر نہیں ہوگا۔کیونکہ برائی کے سلوک میں برا ہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔مصنف نے ہمیں اس بات کی یاد دہانی کرائی ہے کہ جب ہم گزرے ہوئے زمانہ بھلائی کے کام کرینگے تو بوڑھاپے کے زمانے میں اس کا ثمرہ اچھا ہی حاصل ہوتا۔یعنی ہم جیسا بوئنگے ویسا ہی کاٹینگے۔یہ نہیں ہوسکتا کہ آم کا پیڑ لگانے پر ببول کے کانٹے ملینگے۔

انجام کیا ملا

سر سید احمد خان ہمیں اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ جوانی کا دور ختم ہونے

پرانسان اپنے سارے کارنامے یاد کر کے دُہراتا ہے کہ اپنی پچھلی زندگی میں کتنے اچھے اور برے کام کیے اور کتنے لوگوں کو دھوکہ دیا اور کتنے لوگوں کو مصیبت میں مبتلا کیا۔ نہ جانے کیا کچھ نہیں کیا جس کی وجہ سے روح بھی شرمسار ہو جائے اور انسانیت رنجیدہ ہو جائے۔ بوڑھاپے میں ایسے کارنامے یاد کر کے ضرور یہ خیال دل سے گزرتا ہے کہ کوئی نہ کوئی انجام روبرو ہونا ہے۔ حقیقت میں اچھائی کا انجام اچھا اور برائی کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی، نہ جانے تو کر کے دیکھ۔ جنت بھی ہے جہنم بھی ہے، نہ مانے تو مر کر دیکھ۔

سرسید احمد خان یہ کہہ رہے ہیں کہ بچپن میں کوئی بھی نیک کام انجام نہیں دیا تھا۔ سارے ذاتی اغراض کیلئے ہوا کرتے تھے۔ قومی بھلائی کیلئے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس طرح مایوس ہو کر وہ دلہن سے ملنے کی کوئی توقع نہیں کرسکتا۔ اس کی پیاری ماں اس کے پاس آگئی۔ اس کو گلے لگا کر اسکی بلائیں لیں۔ اس کو باپ دکھائی دیا اور چھوٹے بھائی بہن اس کے اردگرد جمع ہو گئے اور کہنے لگے کہ سال کے آخر دن کیوں روتے ہو۔ اٹھو منہ ہاتھ دھولو اور کپڑے پہن کر نئے سال کی خوشی مناؤ۔ یہ خوشی کا دن ہے، میں بوڑھے کی طرح نہیں پچھتاؤں گا بلکہ ضرور اس دلہن کو یاد کروں گا جس نے مجھے اپنا خوبصورت چہرہ دکھایا اور اپنا نام بتایا۔ اے خدا تو میری مدد کر۔

محبت کا خواب

اُوپر کی دو تین سطور میں سرسید احمد خان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوا یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو کوئی بھی کام انجام دینے پر یہ سوچنا چاہئے کہ اس کام سے کیا نتیجہ فراہم ہوگا۔ اچھے کام کرنے سے اچھے نتیجے فراہم ہوتے ہیں۔ میں نے جوانی میں جو کچھ بھی کیا خواہ وہ برا کیا یا بھلا کیا اسکے نتائج مجھے ہی جھیلنے پڑیں گے۔ اب

بوڑھاپے کے دور میں میں اپنے ساتھیوں، دوستوں کو یہ نصیحت کر رہا ہوں کہ جوانی میں اچھے اور برے کام کرنے سے ان کے نتائج بھی ویسے ہی سامنے آتے ہیں۔اب میں اس دنیا سے رخصت ہور ہا ہوں اور اپنے رشتے داروں، دوستوں اور ہم وطنوں سے اس بات کی تلقین کرر ہا ہوں کہ ان دنیا میں آ کر یہ سوچنا ہے کہ یہاں کی محبت اور یہاں کا کام کاج محض ایک خواب کے مانند ہے۔آخر کار اس دُنیا سے رخصت ہونا لازمی ہے۔اس دنیا میں میں نے جو بھی اچھے یا برے کارنامے انجام دیئے ہوں اسکو لوگ اسی طرح سے میرا نام لیکر یاد کرینگے۔میرے کارناموں کو میری طرف منسوب کر کے بار بار دہرائیں گے۔اب جبکہ میں رخصت ہور ہا ہوں تو یہی کہونگا کہ دُنیا چند دنوں کے لئے ہے اور اسی لئے یہ ایک خواب کے مانند ہے۔

اگر ہم سرسید احمد خان کی ان باتوں پر تبادلۂ خیال کریں کہ ہر ایک انسان کو اس دنیا میں نیکی کے کام کرنے چاہئے تا کہ انجام اچھا رہے۔وہ ہمیں اس بات کا بھی احساس دلاتے ہیں کہ جوانی کے بعد بوڑھاپہ آنا ایک فطری عمل ہے۔بوڑھاپے میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں ایسے نیک اعمال کرنے چاہئے جس سے بوڑھاپے میں کوئی تکلیف محسوس نہ کریں۔خیر سرسید احمد خان نے بہت ہی اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔اگر ہم اس کے عنوان پر غور وفکر کریں تو ہمیں احساس ہوگا کہ عنوان ''گزرا ہوا زمانہ'' بہت ہی بہترین ہے۔ممکن ہے کہ اسی عنوان پر کسی شاعر نے اس طرز کا شعر لکھا ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

''گزرا ہوا زمانہ آتا نہیں دوبارہ حافظ خدا تمہارا''

میری سوچ کے مطابق اس کا عنوان یہ ہونا چاہئے ''جوانی اور بوڑھاپا''

مولانا محمد حسین آزاد بھی اردو ادب میں ایک قد آور شخصیت تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انھوں نے بہت قسم کی تصانیف لکھیں۔ مولانا اردو کے ایک مشہور نثر نگار مانے

جاتے ہیں۔ مولانا محمد ابراہم ذوق کے والد مولوی باقر کے جگری دوست تھے، لیکن آزاد کو شعر وشاعری سے دلچسپی تھی۔ اس پر ذوق جیسے استاد کی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ آزاد نے ان کے ہمراہ دلی کے اکثر مشاعروں میں شرکت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد بہت جلد اُستاد ذوق کے پختہ کلام، اعلیٰ خیال اور سنجیدہ قدرت بیان و زبان سے بہرہ ور ہو گئے۔

آزاد کی مشہور تصنیف ''اپنی مصیبت'' پر مختصر دلیل بیان کی ہے۔

مختصر کہانی یہ ہے کہ انسان کسی حالت میں خوش نہیں رہتا ہے۔ تمام تر وسائل حاصل ہونے پر بھی غمزدہ رہتا ہے۔ اگر غم کو برابر برابر تقسیم کیا جائے تو اس تقسیم سے انسان میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ وہ یہ کہے گا کہ پرانے طریقے کا غم اچھا ہے۔ اگر کوئی کسی کی مصیبت کو حل کرنے کی پیش کش کرے گا تو یہ لوگ اس سے بھی مطمئن نہیں ہوئینگے بلکہ اور زیادہ اپنی مصیبتوں کی شکایت کرینگے۔

یہ سوچ کر مصنف کو نیند نہیں آئی، سوچنے لگا کہ آخر جب مسائل حل ہو جاتے ہیں تو پھر نئی مصیبتیں کیوں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سوچتے سوچتے مصنف محوخواب ہو جاتا ہے۔

سلطان اخلاق کے دربار میں ایک اعلان جاری ہوا ہے کہ دنیا کے تمام لوگ اپنی آسائش وآفات لا کر ایک جگہ ڈھیر لگائیں اس حکم نامے کی تعمیل کرنے کے لئے لوگ آنے لگے اور اپنی اپنی مصیبت کا بوجھ سر سے اتار کر پھینکنے لگے۔ مصیبت کا بوجھ پرانے ڈھیر سے بھی اونچا ہو گیا۔ مطلب ہر بار مصیبت کا ڈھیر دوگنا ہوتا چلا گیا۔

لوگوں کا بوجھ ختم نہیں ہوا اور بڑھتا گیا۔ بلا شک مدد کر رہا تھا وہ وہم جس کے ہاتھ میں آئینہ تھا جس میں نظر ڈالنے سے مشکل بہت بڑی لگنے لگی تھی۔ اس نے عجیب وغریب لباس پہنا تھا اس کی آنکھوں میں وحشت کھٹکتی تھی۔ اتنے میں ایک آدمی نے مصیبت کا بوجھ اتار کر پھینک ڈالا۔ اسی قسم کے اور لوگ بھی مصیبت کا بوجھ پھینکنے لگے۔

کسی نے گناہوں کا بوجھ پھینکا۔ پھر بھی لوگ خوش نظر نہیں آئے۔ آزاد کے مضمون کا مفہوم یہ ہے کہ وہم وفکر سے انسان کا غم بڑھتا جاتا ہے تو ان کا کچھ نہ کچھ علاج کرنا چاہیئے جس سے کہ مصیبت کم ہو جائے۔

میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کرتا ہوں:

تقسیم

آزاد کا مضمون ''اپنی مصیبت'' جو کہ انکی کتاب نیرنگ خیال سے انتخاب کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے فرمایا ہے کہ اس نے ایک خواب دیکھا جس میں سلطان اخلاق کے دربار سے ایک اعلان جاری ہوا کہ تمام دنیا کے لوگ اپنی اپنی مصیبتوں کے بوجھ اپنے سر سے اتار کر پھینکیں۔ تو ان کے بوجھ بجائے کم ہونے کے اور زیادہ ہو جاتے تھے۔ ان لوگوں کا بوجھ بندھوانے اور لدوانے میں ایک سوکھا، سہما ہوا کمزور آدمی مدد کر رہا تھا۔ دراصل وہ وہم تھا اسی کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں نظر ڈالنے سے شکل بہت بڑی دکھائی دینے لگتی تھی۔ اس نے ایک عجیب وغریب قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف وہراس ٹپک رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص نے ایک بھاری گٹھڑی سر سے اتار پھینکی۔ ان سطور سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کہتے ہیں انسان کی زندگی ایک گٹھڑی کے مانند ہے جس میں مختلف تقسیم مصیبتیں بندھی ہوئے ہیں۔ ہر ایک گٹھڑی دوسری سے مختلف ہے۔ یعنی مصیبت سے بھری گٹھڑی میں یکسانیت نہیں ہے۔ ہر ایک کی زندگی میں مختلف قسم کی مصیبتیں آتی اور جاتی رہتی ہیں۔

کیا وزن کیا صورت

آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ ایک ایسی جماعت جمع ہوئی جن کے اوپر مصیبتوں

کے بوجھ ہیں۔ان کے لئے آسمانی سلطان کی طرف ایک حکم جاری ہوا کہ اب ہر شخص اپنے بوجھ کی شکل وصورت تبدیل کرسکتا ہے۔یعنی جس کے پاس کسی بھی قسم کی مصیبت ہو وہ اسے اپنے گھر میں اپنے پاس رکھ سکتا ہے اور نہایت ہی چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ اس مصیبت کو مٹانے کی کوشش کرسکتا ہے۔لیکن جب یہ ہلکی ہو جاتی ہے تو نیا بوجھ سامنے آجاتا ہے۔یعنی مصیبت کا کارواں چلتا رہتا ہے اور ہر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کتنا وزن ہے اور کیا صورت ہے۔

خوددار شخصیت

آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ اس مختصر سی زندگی میں ہر انسان مصیبتوں میں گھرا ہوا رہتا ہے۔کوئی ہلکی مصیبت تو کوئی بھاری مصیبت کو اپنے کندھوں پر اٹھائے رہتا ہے۔ خواہ کوئی کتنی ہی بڑی ہستی کیوں نہ ہو لیکن مصیبت کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔مثلاً جب کوئی شخص زیادہ کھانا کھالیتا ہے۔لیکن کھانا صحیح طرح سے ہضم نہ ہونے کی وجہ سے اسے بدہضمی ہو جاتی ہے۔تو یہ تکلیف اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔ہر ایک کو اپنی قوت برداشت کے حساب سے اپنی مصیبتوں کا بوجھ اٹھانا ہے۔اسی لئے کوئی بھی شخص ہو خواہ وہ خوددار ہو یا کسی کے رحم وکرم پر ہو اسے مصیبت کی گٹھڑی کسی نہ کسی طریقے سے اٹھانی ہی پڑے گی۔

اپنے اپنے خیال

آزاد صاحب فرماتے ہیں ایسے لوگ جو بہت زیادہ رنگین مزاج ہوتے ہیں۔وہ اپنے دن رات کی مشغولیات کو حسین سے حسین تر بنانے کی ہر کوشش کرتے ہیں۔یہ لوگ اپنی زندگی عشق ومحبت میں گزارنا پسند کرتے ہیں۔وہ بھی اپنے سروں پر مصیبتوں کی گٹھڑیاں اٹھائے پھرتے ہیں۔ان کے پاس چند ایسی گٹھڑیاں ہیں جن میں حزن وغم

انکے جذبات کے نیزوں کیوجہ سے دبے ہوئے ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ وہ حزن وغم کے بوجھ ہی سے مصیبت محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات اور تاثرات بیان کر کے اس بوجھ کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور نیا بوجھ اٹھانے کا انتظام بھی قدرت کے اصولوں کے مطابق کرتے ہیں۔

خیالاتِ ترک

جب مصیبت کا زیادہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے انسان بہت ہی تنگ آجاتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ میں نے چند دنوں پہلے ہی بوجھ ہلکا کیا تھا لیکن پھر یہ نیا بوجھ میرے سر پر آکھڑا ہوا۔ اب یہ ادھیڑ بن میں لگ جاتا ہے کہ کس طریقے سے اس بوجھ کو بالکل ہلکا کیا جائے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ مصیبت کا بوجھ ضرور اٹھانا ہے لیکن ایسے کون طریقے اختیار کئے جائیں جس سے یہ بوجھ ہلکا ہو جائے۔ آزاد صاحب کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو ایک خوبصورت نوجوان ظاہر کر رہا ہے لیکن اس کو گردوں کی بیماری لاحق ہے، اس کے مسانوں میں پتھر ہے جس کی وجہ سے کبڑا بن گیا ہے اور سیدھا نہیں چل سکتا ہے۔ لکڑی کے سہارے چلتا ہے۔ ایسی مصیبت کے بوجھ کو ترک کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس مصیبت کے خیال کو ترک نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ تکلیف دینے والی تھیلی کے بارے میں جان کر سب یہ کہہ رہیں ہیں کہ ایسی مصیبت کے خیالات کو ترک نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس سے کسی کو چھٹکارا ملا ہے۔

دیکھا درد کبھی

آزاد صاحب کہہ رہے ہیں کہ انسان نے اس مصیبت کی گھڑی میں ایسی آفت بھی باندھی ہے جس کو ہم نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔ یعنی ایسی آفت جو شاید کسی دوسری مصیبت سے کچھ کم نہ ہو اور وہ ہے موت۔ موت کا ماتم سن کر بہت ہی صدمہ

لاحق ہوتا ہے۔ جیسے کہ آزاد صاحب نے کہا کہ سلطان افلاک کو لوگوں کو ترس آیا اور اس نے حکم صادر کیا کہ اب ہر شخص اپنا بوجھ اتار پھینکے۔ سب کو وہی بوجھ اٹھانا ہے جس کو وہ پہلے اٹھا رہے تھے۔ یہ سن کر ہر شخص نے اپنا اپنا بوجھ اتار پھینکا اور خوشی پہلے کے بوجھ کو کندھوں پر اٹھالیا ساتھ ہی دوسرا حکم بھی سنایا گیا کہ جن لوگوں کے دلوں میں اگر وہم ہو تو اس کو بھی نکال دیا جائے۔ یعنی ایسا کرنے سے شاید مصیبت کا بوجھ کم یا ہلکہ ہو جائے۔

برداشت کے مطابق

آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ انسان جب بہت قسم کی مصیبتیں جھیل کر غمزدہ ہوتا ہے تو یہ بوجھ پہاڑ کی مانند لگتا ہے۔ جس طرح کہ ہم پہاڑ پر چڑھتے چڑھتے تھک جاتے ہیں تو اپنی تکان کو دور کرنے کے لئے کچھ دیر ڈھلوان پر بھی بیٹھتے جاتے ہیں۔ بیٹھ کر تھوڑا آرام کر سکتے ہیں۔ جب ہم دوبارہ چڑھنا شروع کرتے ہیں تو یہ سوچتے ہیں کہ مصیبت کا پہاڑ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ یعنی کبھی برداشت کے مطابق اور کبھی برداشت سے باہر مصیبت کی گٹھڑی ہر ایک انسان کو اسی طریقے سے اٹھانی ہوتی ہے۔

ہمدردی کا اظہار

جب انسان حد سے زیادہ مصیبت برداشت کرتا ہے تو اس کے ہمدرد دوست یہ دیکھ کر افسوس کرتے ہیں کہ کتنا اور بوجھ اٹھانا پڑیگا۔ ابھی تک ہلکا ہی نہیں ہوا۔ بوجھ اٹھا اٹھا کر صحت بھی خراب ہوئی اور دھکے بھی کھائے۔ عمر درازی پر اس بوجھ سے اثر ہونے لگا تو ہمدرد دوست ایسی مصیبت زدہ کیفیت کو دیکھ کر اپنے دوست پر ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے دوست اللہ تعالیٰ اس بوجھ کو کم کردے۔ اگر ہم دوستوں میں کوئی شاعر ہوتا ہے تو وہ یہ شعر فرماتا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

طنز کرنا

اگر کوئی جوان انسان جوانی میں مصیبت کے حالات میں کم گھرا ہوا ہوتا ہے تو وہ دوسرے انسانوں میں مصیبت کا بوجھ زیادہ دیکھتا ہے۔ خود غرض مزاج ہونے کی وجہ سے وہ ان مصیبت زدہ انسانوں کے ساتھ کوئی ہمدردی کا سلوک نہیں کرتا۔ اس کے برعکس وہ ایسے بوجھ اٹھانے والوں کو طنز کرتا ہے جو کہ بہت ہی برا فعل ہے۔

اب ہمیں اس بات کا پورا یقین ہوا کہ نثر نگار نے اپنے مضمون ''اپنی مصیبت'' میں بہت ہی اچھی نصیحتوں سے نوازا ہے۔ ہر ایک انسان کو اپنی مختصر زندگی میں کوئی نہ کوئی مصیبت کا سامنا کرنا لازمی ہے۔ لیکن کسی کو ایسا بوجھ اٹھانے پر طنز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں نثر نگار یہ کہہ رہا ہے کہ انسان کو انسانیت کے دائرے میں رہنا چاہئے کیونکہ انسانیت کے اصولوں پر چلنے سے ہی مصیبت کا بوجھ کم ہوسکتا ہے۔ خواہ وہ ہمدردی کے طریقے سے، مالی امداد کے طریقے سے یا اخلاق کے طریقے سے۔ مصنف نے اس مضمون کا عنوان ''اپنی مصیبت'' رکھا جو کہ میرے خیال سے بہت ہی اچھا ہے لیکن مصنف خود تسلیم کرتا ہے کہ باعث قدرت ہر ایک انسان مصیبت کا شکار ہے۔ مصنف خود کہتا ہے کہ قدرتی آفتوں سے اور کئی دوسرے طریقوں سے مصیبت کا آنا لازمی ہے۔ کیوں نہ اس مضمون کا عنوان ''قدرتی بوجھ'' رکھیں۔ کیونکہ کچھ آفتوں کا نزول قدرت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کا عنوان ''قدرتی بوجھ'' مناسب لگتا ہے۔ خیر دوسرے تنقید نگاروں اور محققوں کی رائے کیا ہوگی یہ وہی جانیں۔

ہم نے دو مضامین پر بحث و مباحثہ کیا پہلا مباحثہ سرسید احمد خان کے مضمون

''گزرا ہوا زمانہ'' اور دوسرا مولانا محمد حسین آزاد کے مضمون ''اپنی مصیبت'' پر لکھا۔ لیکن اگر ہم ان دو مضامین کو غور سے پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ دونوں میں جوڑ ضرور ملتا ہے۔ وہ یہ کہ سرسید احمد خان ہمیں انسانیت کی رواداری اور بوڑھاپا، جوانی کے طور طریقوں سے روشناس کرتے ہیں۔ اسی طرح آزاد صاحب انسانیت کے اصولوں کے ذیل میں مصیبت کی گھڑی کی وضاحت کرتے ہیں۔ مطلب انسان اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں مصیبت کا سامنا کرتا ہے خواہ وہ بوڑھاپا ہو یا جوانی۔ انسان خواہ وہ کسی مذہب کا ہو یا کسی نسل کا ہو یا کسی بھی ذات کا ہو اسے ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے کہ جوانی اور بڑھاپے کے دور میں مصیبتوں اور آفتوں کا سامنا کرنا یقینی ہے۔ ان دونوں مضامین میں دونوں مصنفوں نے اسی بات کا احساس دلایا ہے۔ جسکی وجہ سے میری یہ رائے ہے کہ کیوں نہ ہم ان دونوں مضمونو ں کو جوڑ کر یہ عنوان رکھیں۔ ''دوراستے ایک مقام''۔



غالب کا خط شہادتِ تاریخ

مرزا اسد اللہ خان غالب نے بہت سے خطوط ادیبوں اور دیگر دوستوں کے نام ارسال کیئے ہیں اور انہیں خطوط پر کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ جنہیں ہم غالب کے خطوط کے نام سے خریدتے ہیں۔ غالب کے خطوط پڑھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ غالب بہت ہی سنجیدہ اور قد آور شخصیت رہے ہیں۔ غالب نے شاعری لکھی جو کہ ابھی تک مقبول عام ہے اور ہمیشہ ہوگی، لیکن خطوط پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے بہت سے غم و ستم برداشت کیئے۔ ایک خط میں اپنے ایک دوست کو لکھ رہے ہیں کہ بیماری کی وجہ سے میں شعر کی اصلاح نہیں کر سکا کیونکہ میں چار پائی پر ہی بیٹھا رہتا ہوں اور اُٹھ کر پیشاب کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ یعنی چار پائی کے ساتھ لیٹے رہنے اور اتنی بیماری ہونے کے باوجود بھی اپنے ہمعصر شاگرد کو یہ کہہ رہا ہے کہ وہ شعر کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ یہ پڑھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ غالب اپنے دوستوں اور ہمعصروں کا کتنا احترام اور خیال کرتے تھے۔ بہت سے خطوط پڑھ کر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ غالب دوستی کرنے کے بہت زیادہ مشتاق تھے۔ ہر ایک دوست کو اپنے ادبی انداز سے مطمئن

کرتے رہے۔ لیکن ان خطوط کو پڑھ کر ہمیں یہ محسوس ہو جائے گا کہ غالب کے دور میں ادب کا طرز بیان کیسا رہا ہے۔ کن کن شخصیات نے غالب کے دور میں ادب میں اپنے ادبی جوہر دکھائے ہیں۔ غالب کبھی کسی چیز پر مختصر بیان کرتے ہیں کو کبھی طویل۔ خیر ہمیں یہ تحقیق کرنی ہے کہ غالب کے خطوط نویسی سے موجودہ دور میں کیا کیا فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل خط بطور شہادت

سید صاحب!

نہ تم مجرم نہ میں گنہگار۔ تم مجبور میں لاچار۔ لو اب کہانی سنو۔ میری سرگذشت میری زبانی سنو۔ نواب مصطفیٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے۔ سو ان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہاں گیر آباد کی زمین داری اور دلی کی املاک اور پنسن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچارہ وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ میں بہ مجرد استماع اس خبر کی ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔

ان کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا۔ پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ دن و تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں مگر ہفتے کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمہارا خط آئے تو اس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں۔

روز اِس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے۔ اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں۔ یا دو روپئے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جماعہ دار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا۔ بھائی! تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ "اسد اللہ خان پنسن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پیٹالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنل برن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی قیادت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے" پرسوں یہ بیان جماعہ دار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دیا ہے۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان ودکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انہیں ڈھادو اور آئندہ کے لئے ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت رہنا چاہے بہ قدرت مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے کر اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھئے شہر کے بسنے کا کونسا مہورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کئے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ۔

نور چشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیر الدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی۔ اس میں سے وہ جو چاہیں قبول کر لیں۔

بدھ ۲ر فروری ۱۸۵۹ء　　　　غالب

اس خط کو پڑھ کر ہم یہ دعویٰ سے کہہ رہے ہیں کہ ان دنوں سرکاری انتظام کس طریقے سے چلتا رہا۔ جیسے کہ غالب لکھتے ہیں کہ ''میرٹھ سے آکر دیکھا یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانیدار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے۔ اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں۔'' اسی طرح سے اس خط میں دلیل دے کر ایک مؤرخ ان دنوں کے واقعات حاصل کر سکتا ہے۔ اسی طرح سے اس خط میں غالب مندرجہ ذیل شعر لکھتے ہیں:۔

روز اس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا ہوتا ہے

اس شعر اگر ہم وجودہ زمانے کے حساب سے سمجھیں تو آج کل کے مروجہ انتظامیہ کے ساتھ وابستہ کر سکتے ہیں۔ اب آپ خود اندازہ لگائیے کہ کس دور کی تاریخ غالب بیان فرماتے ہیں جس کا ثبوت اس خط میں اور مندرجہ بالا شعر میں فراہم کیا ہے۔ اس شعر میں مذکور پرانی تاریخ کو بالائے طاق رکھ کر اگر موجودہ دور کی تاریخ سے وابستہ کریں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ انتظامیہ غلط کام کرتی ہے۔ یعنی غالب کے دور کے وقت کی تاریخ اس خط میں بیان کی گئی ہے اور مؤرخ یہ خطوط پڑھ کر خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان دنوں کا انتظام کیسا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ غالب کا رجحان اپنے ہمعصر ادیبوں کے کیساتھ کیسا رہا۔ وہ بھی مؤرخ ان خطوط سے اندازہ لگا سکتا ہے۔ جیسے کہ غالب نے خط میں لکھا:

مارڈالا یار، تیری جواب طلبی نے۔ اس چرخ کج رفتار کا برا ہو، ہم نے اس کا کیا

بگاڑا تھا۔ ملک و مال وجاہ وجلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ وتوشہ تھا، چند مفلس دے بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے۔

سو بھی نہ تو کوئی دم ، دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھتا

یاد رہے یہ شعر خواجہ میر درد کا ہے۔

کل سے مجھ کو میکش بہت یاد آتا ہے۔ سو صاحب، اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں؟ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی، مجھ سے خط پر خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر اس تقریر کی تلافی نہیں کر سکتی۔ بہر حال کچھ لکھتا ہوں، دیکھوں کیا لکھتا ہوں۔

سنو پنسن کی رپورٹ کا ابھی کچھ حال نہیں معلوم۔ دیر آید درست آید، بھئی، میں تم سے بہت آزردہ ہوں۔ میرن صاحب کی تندرستی کے بیان میں نہ اظہار مسرت، نہ مجھ کو تہنیت بلکہ اس طرح سے لکھا ہے کہ گویا ان کا تندرست ہونا تم کو ناگوار ہوا ہے۔ لکھتے ہو کہ میرن صاحب ویسے ہی ہو گئے جیسے آگے تھے۔ اُچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کیا غضب ہوا کہ یہ کیوں اچھے ہو گئے۔ یہ باتیں تمہاری ہم کو پسند نہیں آتیں۔ تم نے میر کا وہ مقطع سنا ہوگا۔ بہ تغیر الفاظ لکھتا ہوں۔

کیوں نہ میر کو مغتنم جانوں
دلی والوں میں اک بچا ہے یہ

میر تقی کا مقطع یوں ہے:۔

میر کو کیوں نہ مغتنم جانیں
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

''میر'' کی جگہ ''میرن'' اور ''رہا'' کی جگہ ''بچا'' کیا اچھا تصرف ہے!

ارے میاں! تم نے کچھ اور بھی سنا؟ کل یوسف مرزا کا خط لکھنؤ سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر خاں عرف نواب جان، والدین کا دائم الحبس ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیا آفت آئی۔ یوسف مرزا تو جھوٹ کا ہے کو لکھے گا۔ خدا کرے اس نے جھوٹ سنا ہو۔

لو بھئی، اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہو اپنے گھر جاؤ، میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خان بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علی خاں، ہم روزہ خوار ہیں۔ وہی حسین علی خاں، جس کا روزمرہ ہے، کھلونے منگا دو میں بھی بجار جاؤنگا میر سرفراز حسین کو دعا کہنا اور یہ خط ان کو ضرور سنا دینا۔ برخوردار میر نصیر الدین کو دعا پہنچے۔

اپریل ۱۸۵۹ء

اب ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ غالب اس خط میں ان دنوں کے شاعروں کے بارے میں بہت کچھ بیان کر سکتے ہیں۔ کچھ کچھ معلومات مؤرخ کو یہ پڑھ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح سے غالب نے یہ خود کہا ہے کہ یہ شعر جو اس خط میں لکھتا ہوں یہ میر کا مقطع سنا رہا ہوں۔ اور اسی مقطع پر اگلا شعر بیان کرتا ہوں۔

اب ہمیں اس بات سے متفق ہونا چاہئے کہ غالب کے خطوط شہادتِ تواریخ ہیں۔



مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین

سابق صدر ہند کی کہانی "آخری قدم"

قومی مفادات کے حق میں

ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۸۹۰ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے، ان کا آبائی وطن قائم گنج سے ڈیڑھ میل دور ایک گاؤں پتوار ہے۔ پتوار پٹھانوں کی ایک پرانی بستی ہے۔ ڈاکٹر حسین کے باپ فدا حسین خان حیدر آباد آئے تھے وہاں انہوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور حیدر آباد کے بڑے وکیلوں میں گنے چنے وکیل مانے جاتے رہے۔ لیکن فدا حسین خان کا انتقال جوانی میں ہی ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ایک قد آور شخصیت ان کا زیادہ تعارف نہ بیان کرتے ہوئے یہ کہنا ضروری ہے کہ وہ ایک قد آور ادیب بھی ادبی حلقوں میں تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک اچھے

عہدے پر قائم رہے اور اپنا ادبی فن پارہ وقتاً فوقتاً ادبی حلقوں میں پیش کرتے رہے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب حکومتِ ہند کے صدر کے عہدے پر منتخب ہوئے۔ انہوں نے بہت سی کہانیاں، افسانے، ڈرامہ اور مذہبی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن اُن ہی میں سے ایک کہانی جس کا عنوان ''آخری قدم'' ہے ایک بہترین کہانی تسلیم کی جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

ایک نیک آدمی کے پاس کافی دولت تھی، وہ اپنی دولت کو دولت نہ سمجھ کر اسے خدا کی دی ہوئی امانت کہہ کر اسے خدا کے بندوں کے نام مختلف طریقوں سے تقسیم کرتا رہا۔ خود نے عیش وعشرت کی زندگی نہیں گزاری، بنگلے میں کبھی قیام نہیں کیا بلکہ چھوٹے سے مکان میں رہ کر اپنی زندگی کا گزارہ کرتا رہا۔ سیدھے سادھے کپڑے پہنتا اور مکئی کی روٹی کھا کر سادہ زندگی بسر کرتا رہا۔ جو دوست اس سے پوری طرح واقف نہیں تھے وہ اسے کنجوس اور گھٹیا آدمی کہتے رہے۔ ان الفاظوں پر بھی اسے کوئی ہتک نہیں ہوتی۔ اس کی دولت سے اکثر لوگ خوش نہیں ہوتے لیکن مختلف طریقوں سے اپنی دولت سے محتاجوں کی مدد خاموشی سے کرتا رہا۔

اس طرح سے اپنی دولت سے محتاجوں، یتیموں، غریبوں اور مفلسوں کی مدد کرتا رہا اور اسی کام میں مست رہا۔ کئی مدرسے، کئی شفاخانوں میں دواؤں کے لئے امداد پہنچاتا رہا۔ ہزاروں بیماروں کو آرام پہنچاتا پھر بھی لوگ اسے کنجوس کہتے رہے۔

اس نے اپنے پاس ایک کتاب رکھ رکھی تھی جس کا نام ''حسابِ امانت'' تھا۔ اس کتاب پر اپنی دولت کا حساب کتاب رکھتا اور اسکو اپنے پاس سنبھال کر وقت بوقت پڑھتا رہتا تھا۔ یتیم طلباء کو پڑھائی کے لئے خرچہ دیتا۔ ڈاکٹری سند حاصل کرنے کیلئے یتیم طلباء کی بھرپور مالی امداد کرتا۔ اس کے علاوہ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک بھی لکھی۔

دسمبر کے مہینے میں سخت علیل ہوا۔ جب ہوش آیا تو سمجھ میں آیا کہ اب اس دنیا کوچ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ یعنی موت دستک دینے لگی ہے۔ اپنی کتاب حسابِ امانت کھولی۔ کھول کر اسے پڑھنے لگا چند منٹ کے لئے اسے دیکھا آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سوچنے لگا کہ کتاب کو جلایا جائے۔ جلانے کے بعد اس کی روشنی دیکھکر مسکرانے لگا۔ نیت کی تھی کہ خدا کے علاوہ کوئی دوسرا اس کے نیک کاموں کے بارے میں نہ جانے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی اس کہانی سے ہمیں علم ہوا کہ دنیا میں بے خوف ہوکر نیک کام کرنے چاہئے اور اپنی نیک نیتی پر پردہ رکھنا چاہیئے۔ اگر کسی محتاج کی ہم مدد کریں تو وہ کسی کو معلوم نہ ہو۔ جیسے کہ اس کہانی میں اس شخص نے اسی وجہ سے یہ کتاب جلائی۔

کر بھلا تو ہو بھلا

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اس کہانی میں ایک نیک آدمی کے اعمال کا ذکر کر کے پڑھنے والے کو نصیحت کی ہے کہ کیسے غریب آدمیوں کو حوصلہ دے کر مالی امداد کی اور کئی لوگوں کے بچوں کو اپنا بچہ سمجھ کر پڑھائی کے لئے خرچہ خود برداشت کیا۔ یہ کہانی ایک حقیقت بیان کرتی ہے کہ کر بھلا تو ہو بھلا۔

بیرونی اور اندرونی حالات

ڈاکٹر صاحب اس کہانی میں فرماتے ہیں امداد کرنے والے کی شہرت ہوتی ہے اور امداد لینے والے کی بدنامی ہوتی ہے۔ سماج اسے گراوٹ کے نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ لینے والا مفلس ہے اور مفلس کو اکثر بے اعتنائی کی وجہ سے سماج میں ذلت کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب اس کہانی کے ذریعہ یہ نصیحت دے رہے ہیں کہ اگر صاحب ثروت کسی حاجتمند کو مالی امداد کرے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوتا کہ مفلس طنز کرنے

والے لوگوں کی طنزیہ باتوں کا شکار نہ ہو۔ اہل خیر بھی اس بات سے خوف ذدہ نہ ہوں کہ لوگ اس کو کنجوس کہنگے۔ اپنی دولت جمع نہ کر کے نیک کاموں میں تقسیم کرنا چاہیئے۔ اس طرح سے معاشرے سے افلاس کا خاتمہ ہوگا اور مفلس لوگوں کو عزت سے زندگی گزارنے کا موقع حاصل ہوگا۔

مذہبی روایت

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس آدمی نے اپنی دولت کو مفلسوں میں تقسیم بھی کیا اور اپنے مذہبی فرائض کو بھی انجام دیا جیسے کہ اس نے کچھ پیسہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک پر بھی خرچ کیا۔ یعنی اس نے اپنے مذہب سے متعلق خدمات کو بالائے طاق نہیں رکھا۔

محتاج ہے یہ آدمی

ڈاکٹر فرماتے ہیں کہ اگر آدمی نے بہت دولت جمع کی، اور اس دولت کا اصراف نہ کرتے ہوئے ان محتاجوں، ضرورتمندوں اور مفلسوں میں تقسیم کی جو کہ حقیقت میں مالی امداد کے مستحق ہیں۔ ان کو دولت کی اشد ضرورت ہے۔ انہوں نے ایسے لوگوں میں خفیہ طور سے تقسیم کر کے اپنا نیک کام انجام دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کہانی کا عنوان ''آخری قدم'' رکھا جو کہ بہت ہی بہترین ہے۔ مطلب جب یہ آدمی بیمار ہوتا ہے تو اسے اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ اس دنیا سے رخصت ہونا لازمی ہے۔ اپنے سارے نیک کام اس کتاب میں لکھے مرنے سے پہلے اس کتاب کو جلا دیا۔ اس کتاب کو جلا کر بہت ہی مطمئن ہوا۔ تو اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ اپنی نیکیوں کی دوسروں کو خبر نہ ہو تو اس نے یہ کتاب جلا کر آخری قدم اٹھایا۔

اگر ہم تنقید کے زاویئے سے اس کہانی پڑھیں تو ہمیں اس طرح کی کیفیات کا ذکر کرنا لازمی ہے۔

مصنف کس دور میں کہانی لکھی

یہ کہانی مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اس وقت لکھی جب ہندوستان میں انگریزی سامراج کے خلاف تحریک اپنی رفتار پکڑ رہی تھی۔ان دنوں انگریزوں کا بستره گول کرنا لازمی ہو چکا تھا۔مصنف نے اس کہانی کو ایسے ماحول سے متاثر ہو کر یہ کہانی تحریر کی ہے جب انگریزی سامراج کی مخالفت حد درجہ عروج پر تھی۔ حقیقت میں مصنف نے اس کہانی کہ ذریعہ امیروں سے درخواست کی ہے کہ وہ غریب عوام کی بھرپور مالی امداد کریں تاکہ وہ خوش رہ سکیں اور انگریزی سامراج کے خلاف تحریک اپنی آخری حد تک پہنچ جائے۔

کالی دولت

ڈاکٹر صاحب اس کہانی کو لکھتے وقت اس بات سے بھی بہت فکرمند تھے کہ ہندوستان میں بہت سارے لوگ اپنی دولت کو چھپا کر رکھتے تھے اور پھر اس کو برے کاموں میں استعمال کرتے تھے۔انکی یہ فکر ان تمام لوگوں کے لئے نصیحت ہے جو اپنی دولت کو برے کام کو انجام دینے لگاتے ہیں۔ بلکہ انہیں اپنی دولت کو غریبوں، محتاجوں اور مفلسوں میں تقسیم کر دینی چاہئے۔ادبی لحاظ سے ہمیں یہ عنوان پسند نہیں آیا۔ میرے خیال میں اس کہانی کا عنوان "خرچہ خرچے کے مطابق" ہونا چاہئے۔خیر اپنی اپنی رائے اپنا اپنا خیال۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ یہ کہانی آج کل کے حالات سے بھی میل کھاتی ہے۔جیسے کہ کالا دھن کو غلط کاموں میں استعمال میں لانا۔جو کہ موجودہ دور میں ایک خطرناک مرض کی طرح پھیل رہا ہے۔یہ کہانی عوامی حلقوں کے لئے موافق

ہے۔اسی لئے ہم یہ دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ مرحوم ڈاکٹر صاحب نے یہ کہانی قومی مفادات کے حق میں لکھی ہے۔

دوسری بات ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب ہمارا ملک انگریزی سامراج سے آزاد ہوا تو ان دِنوں ملک کی معاشی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔اس پہلو کو بھی سامنے رکھ کر ڈاکٹر صاحب نے اس کہانی کو لکھا ہوگا۔لکھتے وقت یہ سوچا ہوگا کہ جب ہم نے آزادی حاصل کی تو ہماری معاشی حالت اتنی بھی نہیں تھی کہ ہم ایک دوسرے کو مالی امداد فراہم کرسکیں۔اس کے لئے امیر لوگوں کو ملکی حکومت کا ساتھ دینا چاہیئے۔ممکن ہے کہ اسی لئے ڈاکٹر صاحب نے یہ کہانی ''آخری قدم''لکھی ہوگی۔مصنف نے یہ عنوان اسی لئے رکھا کیونکہ آزادی کو چند دِن ہوئے تھے اور ملک کی معاشی حالت بہت خراب تھی۔جب تک یہ حالت سدھر نہیں جاتی اس وقت تک امداد کی اشد ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کو ملک سے دھکیلنے کے بعد ہماری معاشی حالت سدھرے گی۔وہ ہمارا آخری قدم ہے۔خیر خیال اپنا اپنا اور رائے دوسروں کی۔



پنڈت رتن ناتھ سرشار کی کہانی

''داروغہ کی پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں''

عنوانِ محاورہ اور آجکل کا انتظامیہ

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بہت سی کتابیں لکھیں ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ بنیادی تعلق ایک کشمیری خاندان سے تھا۔۴ برس کے عمر میں ان کے والد صاحب اِس دُنیا سے رخصت پذیر ہو گئے۔لیکن عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر کینگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی اور انگریزی ادب کا مطالعہ اسی کالج میں کیا۔پھر منشی ناول کشور کی اخبار''اودھ'' کے ایڈیٹر بن گئے اور اسی زمانے میں فسانہ آزاد شروع کیا اور بعد میں فسانہ آزاد ۱۸۸۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

اس کتاب سے پنڈت رتن ناتھ سرشار بہت ہی مشہور و مقبول ہو گئے۔ میں اسی کتاب سے یہ کہانی چن کر اسکی تفصیل بیان کرتا ہوں۔

ایک نواب کے پاس بہت سے ملازم کام کرتے تھے۔ سارے ملازم وفادار رہے لیکن مفت خور بھی رہے۔ جو کچھ بھی نواب کا کام ہوتا وہ کام یہی نوکر اپنی محنت کے حساب سے اچھے خرچے لے کر کرتے رہے۔ یعنی جو بھی خرچہ آتا تھا اس خرچے میں یہ نوکر اپنا خرچہ بھی جوڑ لیتے تھے۔ اس طرح سے اپنی ماہوار تنخواہ وصول کرنے کے ساتھ الگ سے کمائی بھی کرتے تھے۔ ایک دن حلوائی نے اپنا بقایا جات رقم نواب کے نام لکھ کر رکھ لی۔ بقایا جات رقم ایک سو بائیس روپئے دس پیسہ تھی۔ یہ پڑھکر ملازم نے کہا ان میں سے ہمارا خرچہ کتنا ہوتا ہے۔ یعنی رقم وصول کرنے پر ہم کو کتنے روپئے الگ سے وصول ہونگے۔ بائیس روپئے کے حساب سے حلوائی نے خرچہ منظور کیا اور خود سو روپیہ لینے پر رضامند ہو گیا۔ لیکن جب اس قسم کی بات سنی تو ملازم نے داروغہ جی سے کہا کہ وہ نواب کو ہر ایک بات سے آگاہ کرے گا۔ یہ سن کر داروغہ جی بہت ہی پریشان ہو گئے اور خود کہنے لگے کہ اس نے ابھی صبح بونی کی لیکن نہ معلوم خدا کے بندہ نے کدھر سے یہ بات سنی۔

آخر کار پندرہ روپئے وصول کر کے داروغہ جی نے خوجی کو دیئے۔ رقم وصول کرنے کے بعد دونوں نواب کے محفل میں حاضری دینے کے لئے گئے اس کے بعد ایک بزاز آیا اس نے بدیشی ملکوں کے کپڑے دیکھائے بزاز کے کپڑوں سے پردہ فاش ہوا۔ یعنی اس کو جتنی رقم وصول کرنی ہے اس میں سے کچھ رقم داروغہ جی کو حاصل کرنی ہے۔ نواب کو خبر پہنچی کہ اس کے ماتحت کئی ملازم مختلف چیزوں پر دلالی وصول کرتے ہیں۔ دلالی کے پیسوں کا بٹوارہ ہونے پر نواب کے ملازم آپس میں لڑ پڑے۔ نواب تک معاملہ پہنچا۔ نواب نے داروغہ سے پوچھ گچھ شروع کی۔ داروغہ جی نے

کہا کہ یہ خوجی بات بات میں فساد پیدا کرنا چاہتا ہے اور ہر بات میں مخول بازی کا ماحول بناتا ہے۔ بلدیو جی نے کہا کہ وہ آپس میں لڑ پڑے، میں نے سوچا کہ یہ خوب لڑیں گے اس پر نواب نے کہا کہیں ہاتھ پائی تو نہیں ہوئی۔ خوجی نے کہا ایسا کام ہم ملازم نہیں کرتے۔ مخول بازی سے کام چلاتے ہیں۔

اب بزاز نے سات سو روپئے بقایا نکال کر داروغہ سے یہ کہا کہ ایک سو روپئے آپ کے نام ڈالوں گا اور چھ سو روپیہ خود وصول کروں گا۔ اس بات پر بزاز اور داروغہ جی کو اتفاق رہا۔ جب حساب کتاب صاف ہوا تو خوجی نے کہا کہ میں بھی جانتا ہوں اور ان سب باتوں کا ذکر نواب سے کرونگا۔ یہ سن کر داروغہ جی نے خوجی اور بلدیو کو طلب کیا مگر خوجی نے کہا کہ اب سو روپیہ ضرور دینے پڑینگے۔ کیونکہ تم دونوں نے خوجی کی مرمت نواب کے سامنے کی۔ مطلب نواب کے سامنے خوجی کی عزت گرائی۔ داروغہ جی نے چالیس روپیہ دے کر خوجی کو راضی کیا اور چالیس روپئے وصول کر کے ہی داروغہ جی کو کہا کہ پانچوں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔

اوپر کی کہانی سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانے آزاد میں جو یہ کہانی لکھی ہے وہ ادبی لحاظ سے درس بھی ہے اور کہیں نادرست بھی ہے کیونکہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس کہانی میں اگرچہ نواب کے ملازموں کی کردار سازی کی ہے۔ تو دوسری طرف ایک رشوت کے ماحول کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگر ہم غور سے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے اوپر دی ہوئی کہانی کے عنوان پر بحث ومباحثہ کریں تو یہ عنوان ادبی لحاظ سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ ایک محاورہ مختلف زبانوں میں لکھا گیا ہے اور مختلف زبانوں میں اس محاورے کو سب لوگ وقتاً فوقتاً کہتے ہیں۔ مانتے ہیں کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے محاورے کو بطور عنوان لکھا ہے لیکن اس کہانی کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ کس طرح داروغہ جی کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی پانچوں

انگلیاں گھی میں ہیں یہ بات غلط ہے۔ کیونکہ اس کو اپنے ماتحت ملازموں کے لئے بھی رشوت دینی پڑتی ہے۔تا کہ پورا احوال نواب نہ سنے۔اس طرح سے داروغہ جی کو ہتک کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ہاں ہم مانتے ہیں کہ خوجی داروغہ جی کو یہ کہہ رہا ہے کہ اس نے چالیس روپئے وصول کئے۔ وصول کرتے کرتے یہ کہہ رہا ہے کہ پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ داروغہ جی کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔وہ اپنے مالک کے کام کاج میں بے ایمانی کرتا ہے۔

اگر چہ ہم پنڈت رتن ناتھ سرشار کے مختلف پہلوؤں پر ادبی لحاظ سے غور کریں تو ہم اس کہانی کے مندرجہ ذیل واقعات پر بحث کرتے ہیں۔

تاریخ کا دور

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنؤ میں پیدا بھی ہوئے اور لکھنؤ کے ماحول میں پلے بڑھے بھی۔اس کے ساتھ ہی ماحول کے حساب سے اپنی قلم سے زور آزمائی کی۔ یعنی ہم اس بات پر متفق ہوں گے کہ لکھنؤ میں بہت سے گھرانے نوابوں کے رہتے بھی تھے اور رہے بھی ہیں۔اسی لئے لکھنؤ نوابوں کا گڑھ مانا جاتا ہے۔پنڈت رتن ناتھ سرشار نے جب نوابوں کا گڑھ دیکھا تو نوابوں کی تشبیہ دے کر کہانی لکھی۔تاریخی پس منظر میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس کہانی کو لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ نوابوں کے گھر میں کیسا ماحول ہوتا تھا۔

نواب اور امیر گھرانوں کا ماحول

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس کہانی میں بیان کیا ہے کہ نواب خاندانوں میں جو بھی ملازم اپنا کام کرتا ہے اس میں نواب کوئی مداخلت نہیں کرتا۔انہیں اپنے ملازموں پر بہت ہی بھروسہ ہوتا ہے۔مثلاً اگر چہ نواب کو یہ معلوم ہوا کہ داروغہ جی دیانتداری

سے کام نہیں کرتا ہے تو وہ اس بات پر غور نہیں کرتے۔ بلکہ نواب اسے ایسے کام پر حوصلہ افزائی ہی کرتا ہے۔ اگر چہ ہم اس کہانی کو اس دور کے حساب سے سوچیں گے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ہی ماحول سرکاری اور غیر سرکاری انتظامیہ میں ہوتا ہے جس سے کہ رشوت خوری کا ماحول بنتا جارہا ہے اور لوگوں میں سکون ہی نہیں رہا۔ سرکاری اور غیر سرکاری انتظام سے جیسے کہ داروغہ جی اور نواب کی تازہ مثال ہے۔ اگر موجودہ دور میں ایسا ماحول ہو تو بہت سے خدشات پیدا ہو سکتے ہیں۔

پردے میں

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس کہانی میں نواب کا ذکر کیا کہ اسے معلوم ہوا کہ داروغہ جی، ایک غلطی میں مبتلا ہے لیکن وہ سوچ سمجھ کر اسے پردے ہی میں رکھنا چاہتا ہے۔ مطلب وہ کوئی جواب طلبی اپنے ملازم سے نہیں مانگتا ہے۔ وہ ہر ایک نوکروں کو پردے میں ہی رکھنا چاہتا ہے۔ پردے میں رکھنے سے بددیانتی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ اگر کہانی کو موجودہ دور کے ساتھ جوڑا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ کوئی بھی کام پردے میں نہیں رہنا چاہیئے۔ پردے کو فاش کیا جائے۔ اگر چہ رشوت خوری کی یا کوئی غلطی کی خبر بڑے عہدیدار کے پاس پہنچے تو وہ ان غلطیوں کو مبرہ کرے۔ جیسے کہ نواب نے اپنے مالی حالت اچھے ہونے کی وجہ سے ہر ایک ملازم کو عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے پر سختی نہیں کی۔ لیکن آج کل کوئی بھی آدمی کسی بھی ملازم کو عیش وعشرت سے نہیں پال سکتا ہے۔ نوابوں کا دور ختم ہو چکا ہے اس وقت دُنیا میں جمہوریت کا دور چل رہا ہے، جمہوریت کے دور میں کوئی تاناشاہی اور نوکر شاہی برداشت نہیں کی جاتی ہے۔

لالچ کا پھندا

نوابوں کے گھر میں دولت ہونے کی وجہ سے ملازموں میں پیسوں کا لالچ پیدا

ہو جاتا ہے انہیں اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔لیکن ایسے فائدے صرف نوابوں کے دور میں ہی ہوا کرتے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے تاریخی کہانی ہم تک پہنچائی۔ اس کہانی میں داروغہ لالچ کے پھندے میں پھنس کر اپنا خرچہ چلاتا رہا جیسے کہ بزاز سے چھ سو روپئے کے بجائے سات سو روپئے وصول کئے اور ایک سو روپئے میں سے چالیس روپئے دوسرے ملازم کو بطور راز رکھنے کے لئے دیئے۔لیکن آج کل جمہوری نظام میں اس قسم کا ماحول برداشت نہیں کیا جائے گا۔ جمہوری نظام میں اس طرح کی روش اختیار کرنے پر سرکاری سزا مل سکتی ہے۔ایسے کام کو ٹھگ بازی اور رشوت خوری کا نام دیا جا سکتا ہے۔

لالچ بری بلا ہے

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ہمیں سمجھایا کہ لالچ بہت ہی بری بلا ہے۔اس کہانی میں ہمیں یہ بتا رہے ہیں کہ ملازموں کے درمیان عزت و احترام پیسوں کے بٹوارے کی وجہ سے گر گیا۔ جیسے کہ جتنا پیسہ داروغہ جی کو وصول کرنا تھا وہ پیسہ اس نے اپنی لالچ کی وجہ سے اپنے ماتحت ملازم کو دیا اور لالچ کے پھندے میں پھنس کر باقی روپیہ وصول کر کے عزت سے محروم ہوا۔اسی لئے پنڈت رتن ناتھ سرشار اس کہانی میں یہ کہہ رہے ہیں کہ لالچ کرنا بہت ہی بری چیز ہے جس سے خجالت بھی ہو سکتی ہے۔

اپنا مال تجارت کمال

پنڈت رتن ناتھ سرشار اس کہانی میں یہ بتا رہے ہیں کہ گھر کے مالک کو نوکروں پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ایک نواب نے پیسوں کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب کیا ہے۔اگر چہ نواب نوکروں کے بغیر خود حلوائی بزاز کے ساتھ کام نپٹاتا تو اس قسم کی تجارت نوکروں کے درمیان نہیں ہوتی جس سے کہ نواب کے گھر میں

رشوت خوری اور چغل خوری کا ماحول بنتا۔ آج کل نواب کا دور رہا کہاں۔ موجودہ جمہوری دور میں ہر ایک اپنے تئیں آزاد ہے۔ اسی لئے نوکروں پر کوئی بوجھ اس قسم کا نہیں پڑ سکتا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا عنوان اس کہانی کے مطابق صحیح ہے یا غلط۔ مانتے ہیں کہ نوابوں کے دور میں اس قسم کے نوکروں سے تحقیقات نہیں ہوتی تھے۔ لیکن اگر اسی کہانی کو موجودہ دور کے حساب سے لکھیں گے تو کہانی کا عنوان ''کرو رشوت ختم'' ہونا چاہئے۔ یہ میں اپنی رائے لکھ رہا ہوں۔ اب اس بات کا تذکرہ تنقید نگاروں اور محققوں پر ہی منحصر ہے۔



کیا سعادت حسن منٹو کا افسانہ

''قبض''

ربط وضبط کے دائرے میں ہے؟

پہلے ہم سعادت حسن منٹو کے افسانے ''قبض'' کے بارے میں تھوڑی سی دلیل بیان کریں گے۔ یہ افسانہ میں نے سعادت حسن منٹو کے کتاب ''کالی شلوار'' سے چنا ہے۔ اس کتاب میں گیارہ مضامین ہیں ان میں سے ایک کا عنوان ''قبض'' ہے۔ اس کا اقتباس لاحظہ فرمائیں:

عبدالرحمٰن کو فلم کمپنی میں بحیثیتِ ہیرو کے داخلہ ملا۔ پیشتر کہ اس نے ڈائریکٹر صاحب کو دیکھا جو کہ اپنی ٹانگوں سمیت کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا قلم نکالا اور کوئی مقالہ لکھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہیرو ہیروئین کی شوٹنگ بھی دیکھ رہا تھا۔ پاس ہی ایک

صابن کا کارخانہ بھی تھا۔ صابن کے کارخانے میں شور کے سبب کئی وقت کی شوٹنگ منسوخ ہوتی رہی۔ مطلب شور سے فلم کمپنی والے کو خلل پیدا ہوتا، جس سے کہ شوٹنگ کئی گھنٹوں کے لئے منسوخ کرنا پڑتی تھی۔ یہی ماحول عبدالرحمٰن صاحب نے دیکھا اور کسی وقت کئی فلم کی سین بھی نئے سرے سے تبدیل کرنے پڑتے تھے۔ جب عبدالرحمٰن صاحب کو داخلہ ملا تو اس نے ڈائریکٹر صاحب کو اپنا تعارف کرایا۔ تعارف کرانے کے بعد عبدالرحمٰن صاحب نے کہا کہ آپ دلی کے رہنے والے لگتے ہو۔ بہت ہی اچھے اور دیانتدار۔ جواب میں ڈائریکٹر صاحب نے کہا کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ پنجاب کا پشتینی باشندہ ہے اس کی زبان پنجابی ہے یہ سن کر عبدالرحمٰن بہت ہی مایوس ہوا۔ پھر عبدالرحمٰن نے عینک آنکھوں میں لگا کر ڈائریکٹر صاحب کی طرف غور سے دیکھا اور ڈائریکٹر صاحب سے کہا کہ مجھے کچھ التماس ہے۔ ڈائریکٹر صاحب نے رحمٰن صاحب سے کہا کہ بے خوف آپ کچھ بھی پوچھ سکتے ہو۔ رحمٰن صاحب نے کہا کہ جو یہ شوٹنگ چل رہی ہے شاید یہ آپ کی ہی کہانی کے مطابق ہیرو ہیروئن کام کر رہے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب نے کہا کہ مجھے کہانی سے کوئی واسطہ نہیں۔ رحمٰن صاحب نے پھر کہا کہ آپ جیسے مشہور لکھنے والے کے دراصل اثر ورسوخ نہیں ہے۔ اسی لئے ایک بہترین قلمکار کو ادب میں ضائع کیا گیا ہے۔ خیر عبدالرحمٰن صاحب نے آگے کچھ کہتے لیکن وہ ڈر کے مارے کچھ کہہ نہ سکے۔ ڈائریکٹر صاحب نے گذارش کی کہ رحمٰن صاحب بلاخوف آپ کچھ بھی پوچھ سکتے ہو۔ رحمٰن صاحب نے اپنے تھیلے میں سے پانچ چھ مقالے نکالے اور ڈائریکٹر صاحب سے گذارش کی کہ اس میں غلطیاں درست کر دیں۔ ڈائریکٹر صاحب نے رحمٰن صاحب کا قلمی مواد پڑھا۔ پڑھ کر پانچ چھ غلطیاں درست کیں۔ اس پر رحمٰن صاحب بہت ہی خوش ہوئے۔ خوشی کے مارے رحمٰن صاحب نے ڈائریکٹر صاحب کو یہ کہا کہ اگر وہ کچھ بات کہنا چاہیں تو

بلاخوف کہہ سکتے ہیں یہ سن کر ڈائریکٹر صاحب نے کہا کہ پہلے میں نے ہی یہ کہا تھا کہ بلاخوف کچھ بھی پوچھ سکتے ہو۔ یہ سن کر رحمٰن صاحب نے ڈائریکٹر صاحب کو کہا کہ جس طریقے سے آپ کرسی پر بیٹھے ہو اس طریقے سے انسان کو قبض کی شکایت ہوتی ہے۔ یہ سن کر ڈائریکٹر صاحب نے رحمٰن صاحب کو کچھ نہیں کہا۔ صرف یہ محسوس ہوا کہ بیس سال سے لیکر آج تک مجھے اس حالت میں بیٹھنے سے قبض نہیں ہوا۔ خیر اس بات پر ڈائریکٹر صاحب کو رحمٰن صاحب کے ساتھ تلخی پیدا ہونے لگی۔ پیشتر تلخی ہونے سے پہلے رحمٰن صاحب نے ڈائریکٹر صاحب کو کہا کہ آپ کسی اخبار میں بحیثیتِ ایڈیٹر کام کرتے ہیں۔ وہ ہفتہ روزہ اخبار اس کے ہاتھ میں آیا بہت ہی پسند کیا۔ پھر رحمٰن صاحب نے ڈائریکٹر صاحب سے یہ گذارش کی کہ وہ اپنی تصویر اور کوئی مواد اس ہفتہ روزہ اخبار میں چھپوانا چاہتا ہے۔ جواب میں ڈائریکٹر صاحب نے کہا کہ تصویر اخبار میں اپنے وقت پر چھپے گی۔ اس بات پر ڈائریکٹر صاحب کو عبدالرحمٰن کے لئے نفاق پیدا ہوا۔ یعنی اس سے عبدالرحمٰن کے لئے نفرت پیدا ہونے لگی کیونکہ ڈائریکٹر صاحب کہنے لگے کہ خدا قبض سے بچائے۔ کونسی سی غلط بات عبدالرحمٰن نے کہی جس سے ڈائریکٹر صاحب کے اندر ناراضگی اور نفرت ابھرنے لگی۔ اسی لئے ڈائریکٹر صاحب نے کہا:

اس کی پہلی ملاقات پر ذیل کی باتیں میری دماغ میں آئیں۔

۱) یہ ایکٹر جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے بہت بڑا چغد ہے۔

۲) جو کمپنی میں نیا بھرتی ہوا ہے سخت بدتمیز ہے۔

۳) یہ ایکٹر جو کمپنی نے نیا بھرتی کیا ہے پرلے درجے کا مغز چاٹ ہے۔

۴) یہ ایکٹر جو کمپنی میں نیا داخل ہوا ہے مجھے اس سے (ڈائریکٹر) بے حد نفرت پیدا ہوگئی۔

اب جبکہ ڈائریکٹر صاحب کو نفرت پیدا ہونے لگی اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی کچھ عرصے کے لئے زیادہ متحرک ہو جائی گی۔ ڈائریکٹر نفرت کرنے کے معاملے میں کافی مہارت رکھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی میں ڈائریکٹر صاحب کو اس کے سلیقے کا احساس ہونے لگا۔ وہ عبدالرحمٰن کو دوسری کمپنیوں میں بھی فاضل وقت پر کام کرانے کے لئے کوشش کرتا رہا۔ جسے عبدالرحمٰن صاحب بخوبی کرتے۔

بہت سے فلمی اداکاروں نے عبدالرحمٰن کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ اس کے کام سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اسی لئے وہ ڈائریکٹر صاحب کو کہنے لگے کہ عبدالرحمٰن جیسا ہیرو کو ہمارے ساتھ کردار سازی نہیں کرنی چاہیئے۔ اس پر ڈائریکٹر صاحب نے یہ اظہار خیال کیا کہ ان کو بھی عبدالرحمٰن صاحب کے لئے اندر ہی اندر نفرت کی آگ پیدا ہوئی ہے لیکن وہ خود یہ بجھا نہیں سکتا۔ اس کا بات کرنے کا انداز اچھا نہیں ہے۔ وہ ہر ایک کو یہ بتا رہا ہے کہ قبض سے کیا کیا نقصان پیدا ہوتے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا تم سب کو اس کے خلاف شکایت ہے مگر اس کو میرے خلاف ایک زبردست شکایت ہے۔ تین چار آدمیوں نے اکٹھے پوچھا کہ وہ کیا، ڈائریکٹر صاحب نے طویل مسکراہٹ کے بعد کہا کہ وہ کہتا ہے کہ مجھے دائمی قبض ہے۔ جس کے علاج کی طرف میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ میں اس کو کئی بار یقین دلا یا چکا ہوں کہ مجھے قبض وبض نہیں ہے۔

ساری باتیں میری سمجھ میں آگئیں اور میں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ ڈائریکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے عبدالرحمٰن کا فوٹو اپنے پرچے میں چھپوایا۔ اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لئے ابھی ابھی ہوٹل میں انہوں نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ مجھے زبردست قبض ہو رہا ہے۔

اس گفتگو کے چوتھے دن قبض ہو گیا یہ قبض ابھی تک جاری ہے۔ مطلب دو مہینے

سے قبض کا مریض بنا ہوں۔ پیٹ کی دوائیاں کھائیں لیکن قبض کی شکایت ٹھیک نہیں ہوئی۔ اب ڈائریکٹر صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ حافظ عبدالرحمٰن کو اپنی خواہش پوری کرنیکا ایک موقعہ دے ہی دوں کیا حرج ہے۔ اب اسے محبت ہے نہیں۔

اوپر کی مختصر دلیل سے ہمیں مندرجہ ذیل نصیحت فراہم ہوئی۔

ا۔ ماحولیات

سعادت حسن منٹو صاحب نے اس افسانے ایک امر کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کوئی بھی تجارت شروع کرنی ہو تو وہ ماحول کا جائزہ لیکر شروع کی جائے۔ اگرچہ فلم انڈسٹری قائم کرنی ہو تو پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کوئی بھی روکاوٹ شوٹنگ کرتے وقت نہیں ہونی چاہئے۔ صابن کے کارخانے کے شور سے شوٹنگ میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے کسی بھی وقت شوٹنگ بند کرنے پڑسکتی ہے۔ افسانہ نگار نے یہ صحیح تجویز کیا ہے کہ ہر ایک کام کو ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے انجام دینا چاہئے۔ جس کے اہتمام سے وقت ضائع نہیں ہوسکتا۔

ادب میں ادیب کا ولولہ

منٹو صاحب نے اس افسانے میں ایک بہت ہی اچھی بات لکھی ہے۔ اس افسانے میں ایک کردار عبدالرحمٰن ہے جس کو لکھنے کا بہت ہی شوق ہے اور اپنی تحریر ادبی میدان میں پہنچانا چاہتا ہے۔ اس ولولے کا اظہار کرنے کے لئے وہ ڈائریکٹر صاحب سے یہ گزارش کرتا ہے کہ ان کی تصویر ہفتہ روزہ اخبار میں چھپے۔ مطلب ایک ادیب کو اپنی ادبی صلاحیت دیکھانے کا بہت ہی شوق ہوتا ہے۔ جس کے لئے وہ ڈائریکٹر صاحب سے بار بار تلقین کرتا ہے۔

نافہم آدمی

منٹو صاحب نے عبدالرحمٰن کے کردار کو اس افسانے میں نافہم آدمی قرار دیا۔ لیکن اگر ہم غور سے عبدالرحمٰن کے کردار کا معائنہ کریں تو ہمیں یہ محسوس ہی نہیں ہوگا کہ عبدالرحمٰن ایک نافہم آدمی ہے۔ جیسا کہ منٹو صاحب نے اس افسانے میں یہ بیان کیا ہے کہ عبدالرحمٰن ڈائریکٹر صاحب کو اپنی تخلیق دیکھاتا ہے اور اس بات کی ڈائریکٹر صاحب سے گزارش کرتا ہے کہ ان تخلیقوں کو پڑھ کر غلطیوں سے مبرا کیا جائے۔ ڈائریکٹر صاحب ان تخلیقوں کو پڑھتا ہے اور چھ سات غلطیاں درست کر کے یہ تخلیق عبدالرحمٰن کو واپس کر دیتا ہے۔ چھ سات غلطیوں کے وجہ سے ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ عبدالرحمٰن کا کردار اس افسانے میں نافہم ہے۔ تو ہم عبدالرحمٰن کو ایک سنجیدہ ایکٹر تسلیم کریں گے۔ اس کے برخلاف دیگر کردار یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کے ساتھ کام نہیں کریں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ نافہم ہے اگر مصنف نے نافہم کا لفظ استعمال کیا تو پھر یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ اس کو فلم کمپنی والوں نے داخلہ کیسے دیا۔ فلم کمپنی والوں نے اس میں صلاحیت دیکھی اور اس کے مطابق ہیرو کا کردار کرنے کے لئے داخلہ دیا۔

عنوان ''قبض'' صحیح ہے

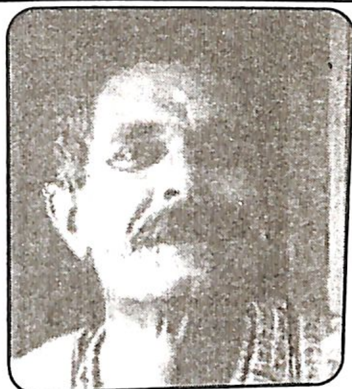
مصنف نے اس افسانے کا عنوان قبض صحیح رکھا ہے۔ اگر کوئی کسی کمپنی یا ادارے کا ڈائریکٹر ہو تو اس کو ربط وضبط سے کام لینا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ایک بڑے عہدے پر فائز ہے اس کے ماتحت بہت سے ملازم کام کرتے ہیں۔ سمجھو کہ ایک بڑی تنظیم چلتی ہے جس میں کہ ایک اعلیٰ رکن ڈائریکٹر کام انجام دیتا ہے۔ اگر یہ ڈائریکٹر غلط طریقے سے اپنا کام انجام دے یا اسے اٹھنے بیٹھنے کے صحیح طریقے معلوم نہیں ہیں

تواس کمپنی میں خسارہ ہوگا یا اس کمپنی کی تعریف غیر لوگ صحیح نہیں کریں گے۔اسی لئے غیر آدمیوں کی تعریف لازماً ضروری ہے۔اگر کمپنی کو تعریف حاصل ہوگی تو تجارت بھی بہترین ثابت ہوگی۔اسی لئے مصنف نے ڈائریکٹر کے بیٹھنے کے ڈھنگ کو بیان کیا ہے کہ جس طریقے سے وہ اپنے ٹانگوں سمیت کرسی پر بیٹھا تھا وہ طریقہ ربط وضبط کے خلاف ہے۔اس سے کمپنی کی عزت واحترام ختم ہوسکتی ہے۔میں اپنی رائے دے رہا ہوں کہ عبدالرحمٰن صاحب کو ڈائریکٹر کے اس طریقے سے بیٹھنے پر بہت ہی صدمہ ہوا اور اس صدمے کا اظہار کرنے کے بجائے اس نے ڈائریکٹر صاحب کو قبض کا شکار ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا۔ڈائریکٹر صاحب کی عزت واحترام کرتے ہوئے عبدالرحمٰن نے ربط وضبط سے کام لیا اور ڈائریکٹر صاحب کو اس طریقے سے بیٹھنے پر ایسا لفظ استعمال کیا کہ جس سے یہ محسوس ہوجائے کہ قبض کا لفظ کیوں کہا۔مصنف نے ایک دلیل کی طرف توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا ہے کہ ڈائریکٹر صاحب ایک عمر دراز سے اسی طریقے سے بیٹھنے عادی ہوگئے تو اس طرح کی بیماری کا شکار ہونا لازمی ہے۔یعنی ڈائریکٹر صاحب کے پاس ربط وضبط قائم نہیں ہے۔اگر کوئی غیر پہلی بار کسی کمپنی میں جاتا ہے تو وہ پہلے کمپنی کے ڈائریکٹر کے پاس ہی جانا چاہتا ہے۔اسی لئے ڈائریکٹر صاحب کو اٹھنے بیٹھنے کی تمیز ہونی چاہیے۔

عبدالرحمٰن کو کہنے کا ڈھنگ

اب جبکہ اس کمپنی میں عبدالرحمٰن کو داخلہ ملا۔داخلہ ملنے کے بعد اس کو دوسری کمپنی والوں نے بھی داخلہ دیا، کیونکہ اس میں ہیرو کی صلاحیت تھی اور اسی وجہ سے ہی اس کی مانگ دن بدن بڑھتی گئی۔ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس افسانے میں عبدالرحمٰن کا اچھا کردار نہیں ہے۔اگرچہ ڈائریکٹر عبدالرحمٰن کے اشارۂ قبض پر ہی غور وخوض کرتا تو وہ

نہایت ہی بہترین ڈائریکٹر ثابت ہوسکتا تھا۔ مانتے ہیں کہ ڈائریکٹر کی قلمی صلاحیت اچھی ہے لیکن قلمی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ربط وضبط کا صحیح ہونا لازماً ضروری ہے۔ سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''قبض'' ربط وضبط کے اعتبار سے بہترین افسانہ ہے۔ میں یہ تسلیم کر کے اپنی رائے ادیبوں اور محققوں تک پہنچا رہا ہوں۔



کنہیا لال کپور کی کہانی

"ہدیۂ عقیدت"

صحیح نصیحت و غلط عنوان

کنہیالال کپور نے اپنی کتاب "نرم گرم" لاجپت رائے اینڈ سنز اُردو بازار دہلی سے چھپوا کر ادبی میدان میں پہنچائی۔ ۲۶رجنوری ۱۹۵۷ء نرم گرم شائع ہوئی ہے۔ اس میں کنہیالال کپور کی ۱۸ کہانیوں پر مشتمل کتاب شائع ہوئی ہے۔ ہر ایک کہانی بہت ہی بہترین اور اچھے خیالات سے بھرپُر ہے۔ ان کہانیوں کی حقیقت جو بھی ہو ہمیں اُس لحاظ سے سوچنا نہیں چاہئے بلکہ یہ غور کرنا چاہیئے کہ ایک ادیب نے اپنے خیالات کس طرح جمع کر کے ایک تحریری شکل میں ادبی بازار تک پہنچائے۔ اس کتاب

میں ہر ایک کہانی بہت ہی اچھی ہے۔ ان میں سے ایک کہانی ''ہدیۂ عقیدت'' کو مختصر انداز میں بیان کرتا ہوں۔

شمس نظامی ایک غیر اور ناواقف خاکسار شاعر کے حضور ایک سردہ پیش کیا۔ خاکسار شاعر نے شمس نظامی سے کہا کہ یہ مجھے کیوں پیش کیا۔ نہ مجھے آپ کے ساتھ کوئی واقفیت ہے نہ آپ مجھ کو جانتے ہو۔ شمس نظامی نے جواب دیا کہ آپ کا کلام اخباروں میں چھپتا ہے جس سے مجھے آپ سے واقفیت ہوئی۔ آپ کا قلم رابندناتھ ٹائیگور اور منشی پریم چند کے برابر کہہ کر آپ کی تعریف ہمیشہ اپنے دل سے کرتا رہتا ہوں۔ خاکسار شاعر نے یہ سن کر سردہ کو اپنی بیوی کے حوالہ کیا۔ بیوی نے ہاتھ میں پکڑ کر کہا کہ اس پھل کو لینے میں بہت خوش ہوئی۔ اس سے پیشتر خاکسار شاعر نے شمس نظامی سے یہ بھی کہا کہ آپ کیا کام کرتے ہو۔ جواب میں شمس نظامی نے کہا کہ کوئی کام کر کے خاص نفع نہیں کمایا۔ مختلف کاموں میں نقصان ہونے کے سبب اب لانڈری میں کام کرتا ہوں۔

دو تین دن کے بعد شمس نظامی خاکسار شاعر کے گھر جا کر درخواست کرتا ہے کہ میرے ساتھ سنیما ہال چلیئے فلم دیکھنی ہے۔ جواب میں خاکسار شاعر کہتا ہے کہ وہ فلموں میں دلچسپی نہیں رکھتا ہے۔ جواب سن کر شمس نظامی کہہ رہا ہے کہ اس نے سینما کے مالک سے پاس لایا ہے اور اس پاس کا فائدہ تو اٹھانا ہی ہے۔ شمس نظامی خاکسار شاعر کو مجبور کر کے سنیما ہال کے اندر پہنچاتا ہے۔ دونوں فلم دیکھ رہے ہیں لیکن خاکسار شاعر میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آئی وہ سنیما ہال میں تنگ آ گیا لیکن اپنا وقت گزارنے کے لئے وہ شمس نظامی کی حرکتیں دیکھ کر بہت ہی خوش رہا۔ اتنا خوش رہا کہ وہ بھی ہنسنے لگا۔ یعنی جب خاکسار نے فلم دیکھی تو شمس نظامی کی حرکتیں دیکھ کر خاکسار شاعر متاثر رہا اور خوشیوں سے لرز اٹھا کیونکہ شمس نظامی فلم دیکھ کر عجب طریقے سے ہنستا رہا اور ہاتھوں

سے عجیب حرکتیں کرنے لگا۔

پھر پانچ چھ دِن گزرنے کے بعد شمس نظامی خاکسار کے پاس آکر گزارش کرنے لگا اور یہ تلقین کرتا رہا کہ اُس کا بہنوئی بیکار ہے اب سرکاری نوکری کے لئے ڈپٹی کمیشنر نے بلایا ہے۔ خاکسار سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ڈپٹی کمیشنر صاحب کے پاس جا کر کوئی سفارش چلائے۔ جواب میں خاکسار کہہ رہا ہے کہ اس سے مطلقہ ڈپٹی کے ساتھ کوئی واقفیت ہی نہیں ہے۔ جواب میں شمس نظامی کہتا ہے کہ آپ کی قلم سے تمام تر لوگوں کو واقفیت ہے۔ خیر خاکسار سفارش کرنے سے انکار ہی کرتا ہے۔

پندرہ دِن کے بعد شمس نظامی خاکسار کے گھر جا کر مبارک باد دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اُن کے بہنوئی سرکاری نوکری حاصل ہوگئی۔ یہ سن کر خاکسار بہت ہی خوش ہوتا ہے لیکن ساتھ میں یہ بھی کہہ رہا ہے کہ کوئی کام میری سفارش کے بغیر پورا ہوا۔

اب شمس نظامی ایک مہینے کے بعد خاکسار کے گھر جا کر اسے تھانے میں جانے کے لئے مجبور کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اس کے بہنوئی کو گرفتار کیا گیا۔ کیونکہ اس کے دفتر میں ٹائپ رائٹر کی چوری ہوئی ہے اسی لئے پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ اب شمس نظامی خاکسار سے گزارش کرتا ہے کہ تھانے میں جا کر خود تھانیدار سے یہ کہو کہ انہیں تھانے سے رہا کیا جائے۔ خاکسار کہہ رہا ہے میں تھانیدار کو نہیں جانتا ہوں۔ میں کیسے ان سے یہ کہوں کہ رہا کیا جائے۔ خیر شمس نظامی بہت ہی مجبور کر کے خاکسار شاعر کو اپنے ساتھ لیکر تھانے تک پہنچتا ہے وہاں پر شمس نظامی تھانیدار سے کہتا ہے کہ میں ایک بڑا عالم اپنے ساتھ لایا ہوں۔ ان کی کئی تخلیقیں مختلف روزمرہ اخباروں میں چھپتی ہیں۔ تھانیدار شمس نظامی سے یہ کہتا ہے کہ میں اس قسم کے ادبی محاورے نہیں پڑھتا ہوں اور نہ ہی مجھے ادب کے ساتھ کوئی وابستگی ہے۔ آخر کار تھانیدار خاکسار کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور خاکسار تھانیدار سے گزارش کرتا ہے کہ انہیں ان کے بہنوئی کو رہا کیا

جائے۔اس بات پر تھانیدار خاکسار کو کہتا ہے کہ ایک مجرم کی سفارش کوئی قلم کار کرے تو اس کا قلم کیسا ہوگا۔خیر خاکسار خاموش رہ کر تھانے سے واپس گھر کی طرف جاتا ہے۔

کئی دنوں کے بعد خاکسار اپنے گھر میں بہت سے اخباروں کو پڑھتا ہے۔ایک ایسی خبر بھی پڑھتا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ شمس نظامی کے دُکان میں چوری کا مال برآمد ہوا اور شمس نظامی فرار ہے۔پولیس اس کی تلاش میں ہے یہ پڑھ کر خاکسار بہت ہی غمزدہ ہوتا ہے اور اس خبر سے اپنی بیوی کو واقفیت کراتا ہے۔

چند دِنوں کے بعد خود شمس نظامی خاکسار کے گھر جاکر اپنی دلیل سے روشناس کراتا ہے کہتا ہے کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔اب وہ خود گرفتاری کے لئے تیار ہے۔یہ معاملہ اس دلیل سے پیش آیا کہ کسی غیر آدمی نے سائیکل اس کی دُکان کے پاس رکھی وہ سائیکل چوری کی تھی لیکن پولیس کے زد میں چوری کا مال ہی سمجھا گیا۔جس سے وہ مجرم قرار دیا گیا۔اب جب میں خود کو گرفتاری کے لئے پیش کرونگا تو اس وقت ایک ہزار کی ضمانت رہائی کے لئے ضروری ہے۔خاکسار سے گزارش کرتا ہے کہ ایک ہزار کی ضمانت دے کر فوراً تھانے سے بری ہوسکتا ہے۔یہ بات سن کر خاکسار ہمدردی سے شمس نظامی کو یقین دلاتا ہے کہ وہ ضمانت دے گا۔اس طرح سے خاکسار نے شمس نظامی کے رہائی پر ایک ہزار کی ضمانت دی۔

چند دنوں کے بعد خاکسار کو معلوم ہوتا ہے کہ شمس نظامی بھاگ گئے ہیں اور خاکسار بہت ہی پریشان رہتا ہے ایسی باتوں سے اپنی بیوی کو واقف نہیں کراتا خود تھانے میں جاکر ایک ہزار روپئے کا جرمانہ دے کر اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

ایک سال گزرنے کے بعد خاکسار کے گھر میں کوئی آدمی آتا ہے۔وہ تربوزہ پیش کرتا ہے خاکسار اسے لینے پر رضامند نہیں ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کی بیوی خاکسار

کو لینے کے لئے مجبور کرتی ہے لیکن خود خاکسار کافی گھما گھمی کے بعد مسترد کرتا ہے۔

اب اوپر کی کہانی سے مجھے مختلف شکوک مصنف پر پیدا ہوئے وہ اس طرح ہیں:

عنوان کے لحاظ

میں مانتا ہوں مصنف نے صحیح کہانی لکھی ہے لیکن لکھنے کے بعد مصنف نے جو عنوان لکھا ہے وہ قابل اعتراض ہے۔ منصف نے لکھا ہے کہ ''ہدیہ حقیقت'' ہدیہ لفظ عربی اور فارسی کا ہی ہے۔ عقیدت اُردو کا لفظ ہے لیکن دونوں جوڑنے کے بعد یہ اسلامی روایت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ روزمرہ کے ادب سے وابستہ نہیں ہوسکتا۔ ہم جب کسی متبرک آستان پر جاتے ہیں وہاں زائرین اپنا اپنا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔ یعنی اپنے اپنے طریقے سے نظرانے میں پیسے اور سامان دیتے ہیں۔ اس نظرانے کو ہدیہ کہا جاتا ہے جیسا کہ ہدیہ نعت۔ مصنف نے لفظ عقیدت لکھا ہے لیکن عقیدت اس کہانی میں مناسب نہیں لگتا جیسے نظرانے عقیدت۔ عقیدت تب پیش کرتے ہیں جب کوئی اس دُنیا سے فوت ہو۔ جس طرح سے ہم کہتے ہیں نظرانے عقیدت۔ اسی لئے مصنف نے یہ عنوان بہت ہی غلط لکھا ہے کیونکہ اسلامی روایت کا ادب کے ساتھ تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ یہ ادب برائے ادب اُردو زبان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی لئے مذہبی ادب نہ ہونے کی وجہ سے ہدیہ عقیدت کا عنوان صحیح نہیں ہے۔ خیر مصنف نے کیا سوچ کر عنوان چنا ہے میں اس بات پر کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔ یہ ادبی دوستوں اور محققوں کا ہی کام ہے۔ اپنی اپنی رائے اور اپنا اپنا خیال ہے۔

ادھوری بات

مصنف ہمیں اس کہانی میں یہ کہہ رہا ہے کہ کسی شاعر کے پاس ایک آدمی آیا جس

کے ساتھ شاعر کی واقفیت ہی نہیں ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ شاعر بہت ہی مشہور ہے اخباروں میں ان کا کلام چھپتا ہے لیکن کسی غیر آدمی کا آنا ایسے ہی نہیں ہے۔ دراصل اس آدمی کا آنا اور تعلق رکھنا کہانی کی شکل دینا ہے۔ اگرچہ شمس نظامی شاعر کے پاس نہیں آتا تو کہانی نہیں لکھی جاتی۔ شمس نظامی کے کام کاج سے ہی کہانی کا ولولہ مرتب ہوتا ہے۔ مصنف آغاز میں کہہ رہا ہے کہ شاعر کی بیوی انہیں مجبور کرتی ہے کہ آپ تربوزہ کو قبول کرلیں۔ لیکن مصنف نے جب کہانی لکھی اور اس کے بعد پہلے قصے کو جوڑ دیا جس سے کہ شاعر تربوزہ لینے سے انکار کرتا ہے مطلب مصنف نے اس کہانی کو بہترین ڈھنگ سے لکھا ہے۔

فلم جانا

اگر مصنف یہ کہتا ہے کہ شمس نظامی کو خاکسار شاعر کے ساتھ گہرے تعلقات نہیں تھے تو پھر کیسے فلم دیکھنے کے لئے گئے اس کا مطلب کہانی کو وسعت دینے کے لئے یہ دلیل بھی بتائی ہے۔

چوری کا مال

مصنف کہانی میں بتا رہا ہے کہ چوری کا مال پولیس نے شمس نظامی کے دُکان سے برآمد کیا۔ اگر مال برآمد ہوا تو اس کارنامے سے خاکسار نے اسی وقت شمس نظامی کے ساتھ تعلقات مسترد کیوں نہیں کئے۔ دراصل مصنف نے کہانی کو بڑھانے کے لئے ایسی باتیں لکھی ہیں۔

تھانے میں خاکسار کو پیش آنا

ایک شاعر کے لئے مصنف نے ایک ایسی بات کہی ہے جس سے شاعری کا قلم

بالکل برباد ہوسکتا ہے جیسے کہ تھانیدار نے شاعر کو کہا کہ ایک شاعر کو جرم کرنے والے کے ہاتھ بٹانا نہیں چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ اگر چوری ہوئی تو چور کو فائدہ دینے کیلئے سفارش کرنا ایک قلم کار کے لئے شوبھا نہیں دیتا۔ مصنف نے یہ بات صحیح کہی ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کو بحث کرنے کے بعد اب خود پڑھنے والے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیا کنہیالال کپور کی کہانی ہدیۂ عقیدت صحیح نصیحت و غلط عنوان پر اُترتی ہے یہ کام باقی ادیبوں اور محققوں پر بھی چھوڑتا ہوں۔ لیکن اپنی رائے بھی لکھ رہا ہوں۔



اُپندر ناتھ اشک

اشک کی کہانیاں

انسانی جذبات وفرقہ وارانہ ملاپ

پہلی اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اُپندر ناتھ اشک نے کالے صاحب مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اُردو بازار دہلی کے اشتراک سے کتاب چھاپی۔ چھاپ کرادب نواز دوستوں کے ہاتھ میں آئی۔اشک صاحب نے بہت سی کہانیاں لکھیں۔اس میں جناب اشک نے آٹھ کہانیاں لکھی ہیں اوراس کتاب میں صالحہ عابد حسین کے پیش لفظ ہیں۔سب کہانیوں کو نچوڑ کر ہمیں قومی یکجہتی فرقہ وارانہ میل ملاپ کی نصیحت فراہم کی ہے۔گھریلو، سماجی نصیحت بھی فراہم ہوتی ہے لیکن کہانیوں میں جناب اشک صاحب کی کہانی ''ٹیبل

لینڈ'' بہت ہی بہترین کہانی تسلیم کی جاتی ہے۔ جو کہ مختصراً بیان کرتا ہوں۔

پیش لفظ کے حوالے سے بھی اور کہانی پڑھ کر بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے سارے واقعات کہانی کے انداز میں بیان کئے ہیں۔ جس دن ہندوستان اور پاکستان تقسیم ہوا۔ اِس کہانی میں نسلی فسادات کے واقعات مصنف نے لکھیں ہیں اور پڑھنے والے کو نصیحت ملتی ہے کہ نسلی فسادات سے نجات ملے اور فرقہ واریت اور بھائی چارہ ہی ایک اچھالین دین دُنیا میں ہے۔ جیسے:

دینا ناتھ ایک ایسا کردار اس کہانی میں مصنف نے لکھا ہے کہ جو لوگ فتنہ وفسادات میں ملوث ہوئے ان کو امداد کے طور پر بہت سے کمبل بانٹے گئے کیونکہ پنجاب سے کئی شررنارتھی آتے تھے اور اُن کو بسترہ کے طور پر کمبل بانٹے جاتے تھے۔ یہ دینا ناتھ بھی امداد فراہم کرتے وقت ہمدردی محسوس کرتا تھا۔ وہ بہت لوگوں سے ان شررنارتھیوں کیلئے پیسے جمع کرتا تھا۔ دینا ناتھ چندہ جمع کرتے وقت امیر لوگوں کو احوال سناتا تھا کہ بہت سے لوگ شررنارتھی بن کر بہت سے کیمپوں میں ٹھہرے ہیں ان کے لئے کھانے پینے کے لئے چندہ جمع کرنا ہے۔ دینا ناتھ کی دوستی مسلمانوں بھائیوں کے ساتھ رہی۔ مسلمان بھائی اس سے کئی فلموں میں کام کراتے رہے۔ بہت سے مسلم ڈائریکٹر دینا ناتھ کے کام سے بہت ہی متاثر تھے۔ جب نسلی امتیاز ملک میں ابھرا تو یہ حال دیکھ کر دینا ناتھ کو نفرت ہونے لگی یعنی وہ مسلمانوں کے ساتھ ٹھیک طرح سے بات نہیں کرتا تھا اور دوستی ترک کر دی۔ لیکن مسلم برادری کو اس رویہ کے بعد بھی محبت کرتے رہے۔

جب دینا ناتھ کو لاہور سے خط موصول ہوا جس میں یہ لکھا گیا تھا کہ اُن کا بھائی بہت ہی برے حالات میں پھنسا ہوا ہے۔ محلّہ وار لاہور میں نسلی فسادات اُبھرے ہیں یہ بات پڑھ کر دینا ناتھ کے دل میں زیادہ آگ ابھرنے لگی۔ اس پر دینا ناتھ کو کچھ

غیر ہندوؤں نے بتایا نہیں لیکن چندہ جمع کرنے وہ صرف ہندوؤں کے پاس جاتا رہا۔مگر راستے میں قاسم نامی ایک دوست نے دیکھا اور اُس نے دیناناتھ کو محبت اور خلوص سے بلایا آپس میں باتیں کیں۔ دیناناتھ کو مطمئن کرایا اور دونوں اس بات پر راضی ہوئے کہ ظلم ہندوؤں کے ساتھ نہیں بلکہ مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوا ہے۔قاسم نے دیناناتھ کو پانچ روپیہ بطور امداد پیش کئے۔دیناناتھ کو پیش کرتے کرتے یہ درخواست کی کہ آپ میرے ساتھ آیئے اور میں یہ چشم دید دکھاؤں کہ ظلم ہندوؤں کے ساتھ نہیں بلکہ مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوا ہے۔پنجاب، بہار، لکھنؤ، ممبئی اور کلکتہ سارا ہندوستان جل رہا ہے۔ یہ نسلی فسادات چند دِنوں کے لئے ہے پھر پرانا بھائی چارہ بحال ہو جائے گا۔

دیناناتھ نے اب غیر ہندوؤں کے گھرانوں میں بھی چندہ جمع کرنے کی مہم تیز کی۔ دو روپئے کم پانچ سو روپئے جمع ہوئے۔اسی اثناء میں دیناناتھ بیمار پڑے اور ہسپتال میں داخل ہوئے۔ وہاں مزاج ٹھیک ہونے کے بعد ہسپتال سے چھٹی ملی اور پھر پیسہ جمع کرنے لگے۔اسی اثناء میں دیناناتھ کو پانچ سو روپیہ جمع ہوئے اس کے بعد دیناناتھ اچانک ایک غیر ہندو کے گھر گھسا۔وہاں پر مسلمانوں کے برے حالات سن کر بہت ہی غم زدہ ہوا۔دیناناتھ کی انسانی دوستی نے انہیں بتایا کہ میں ایک ہندو ہوں اور میں نے شرنارتھیوں کے لئے پانچ سو روپئے جمع کئے ہیں۔جب میں نے یہاں پر آپ کی حالت بری دیکھی اور برے معاشی حالت دیکھ کر میں یہ پانچ سو روپئے آپ مسلمانوں کو پیش کرتا ہوں اب مجھے پورا یقین آیا کہ نسلی فسادات میں ہندو ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی متاثر ہوئے ہیں اور میں انسانیت کے ناطے آپ کا ساتھ ہمیشہ دوں گا۔

اوپر کی کہانی کو مصنف نے اُس وقت لکھا ہے جب کہ ہندوستان پاکستان میں نسلی

فسادات رونما ہوئے تھے۔ یہ تب ہوئے جب انگریزوں نے اپنا بسترہ گول کیا اور جاتے جاتے ایک ایسا ناسور رکھا جو کہ بہت مدت کے بعد ٹھیک ہوا۔ اس کہانی کو پڑھنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُپندر ناتھ اشک نے یہ کہانی اس دلیل پر لکھی ہے۔ اگرچہ اس میں اپندر ناتھ اشک نے صاف ظاہر نہیں کیا ہے لیکن دینا ناتھ کے ذریعہ یہ احساس دلایا ہے کہ نسلی فسادات میں کبھی بھی کسی ایک گروہ کی طرفداری نہیں کرنی چاہیئے۔ بلالحاظ مذہب وملت ہر ایک انسان کے ساتھ یکساں رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔

انسانی قدروں کو پامال نہ کیا جائے

مصنف نے دینا ناتھ کے کردار کے ذریعہ پڑھنے والوں کو سمجھایا کہ کس طرح دینا ناتھ بہکاوے میں آیا اور بہکاوئے میں آکر اس کے غیر ہندو دوست دیکھتے رہے۔ انہوں نے اس کے جذبات پر کچھ ٹھیس نہیں پہنچائی۔ لیکن بعد میں اس کے اپنے دوست نے سمجھایا اور چشم دید گواہ بنا کر انسانی قدروں کو پامال نہیں کیا۔ پھر انسانی جذبہ پیدا ہونا ایک قدرتی فعل ہے۔

فرقہ واریت کے خلاف گہری سازش

مصنف یہ بتا رہا ہے کہ جب بھی کوئی فتنہ کسی بھی جگہ رونما ہوتا ہے اس میں سازش ضرور ہوتی ہے اور اس سازش کو ننگا کرنے کے بعد لوگوں میں امن کی لہر پھر ابھرنے لگتی ہے اور فرقہ واریت اور نسلی فسادات رونما نہیں ہوتے ہیں۔ یہی انداز مصنف نے ہندوستان پاکستان کے تقسیم نامے میں لکھا ہے۔ جیسے کہ دینا ناتھ کا کردار لکھ کر مصنف کہتا ہے کہ جب دینا ناتھ کو قاسم سمجھاتا ہے اور سمجھنے پر یکجہتی کی لہریں پھر سے اُبھرنے لگتا ہے۔

تنگ نظر لوگوں سے ہمیشہ بچنا چاہیئے

خود مصنف لکھتے ہیں کہ دینا ناتھ کو اسکا کوئی رشتہ دار لاہور سے چٹھی لکھتا ہے جس سے دینا ناتھ میں تنگ نظریہ کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ جیسا کہ

''میں تمھیں خط لکھ رہا ہوں اور لاہور جل رہا ہے۔ محلّہ سرین کٹڑہ پوربیاں، بھائی اور دلی دروازے کے اندر ہندوؤں کے مکان، شاہ عالمی دروازہ اور پاپڑ منڈی سب جل کر راکھ ہو چکے ہیں۔ پاپڑ منڈی کی آگ میں سو سے زیادہ مکان جل گئے۔ آگ رات کے اڑھائی بجے، عین کرفیو کے وقت لگائی گئی جو بجھانے آیا پولیس کی گولی کا شکار ہوا۔ اتنی بڑی آگ لاہور نے کبھی نہیں دیکھی۔ اکبر منڈی۔ لاہور کی سب سے بڑی گیہوں کی مارکٹ پہلے ہی آگ کی نذر ہو چکی ہے۔

رہا پرانے شہر کے باہر کا علاقہ انارکلی میں اُلو بولتے ہیں۔ سول لائنز سہمی سی لگتی ہے۔ امن ہے، لیکن ویسا ہی ہے جیسا طوفان سے پہلے ہوتا ہے۔ مجسٹریٹ سے لیکر معمولی سپاہی تک فرقہ پرست ہو گئے ہیں۔ لاہور کا کام کاج ختم ہو گیا ہے۔ سوچتا ہوں، کسی طرح دونوں مکان بیچ کر بھاگوں۔ لیکن جائدادیں بڑی ہیں اور خریدنے والا کوئی نہیں۔ لوگ بھاگ رہے ہیں۔ شہر سے، سول لائنز سے، سنت نگر سے، رشی نگر سے، رام لور کرشن نگر سے، بھارت نگر اور ماڈل ٹاؤن تک سے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چند دنوں میں لاہور ہندوؤں سے بالکل خالی ہو جائے گا۔

مصنف اوپر کے واقعات لکھ کر یہ بتا رہا ہے کہ کس طریقے سے جذبۂ انسانیت دینا ناتھ کی ترک ہوئی۔ اسی طرح سے جب کوئی غیر آدمی کوئی ایسی بات یا دلیل کسی کو سنا رہا ہے تو وہ بھی جذباتی بن کر غلط کام میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ چندہ جمع کرتے وقت خود دینا ناتھ نے ایسے ظلم غیر ہندوؤں کے زبانی سنے۔ یعنی مسلمانوں کی زبان سے بھی یہ مظلومیت سن کر دینا ناتھ کو ہوش آیا کہ نسلی فسادات ایک ہی گروہ میں نہیں، بلکہ دوسرے گروہ میں بھی ہیں اور اس بات کا جواب بطور انسانیت پانچ سو روپیہ انہیں کو

بطور امداد دیے اور انسانی اخلاق کو پھر سے دماغ میں بحال کیے۔

صحیح مواد کو پڑھ کر انسانیت پامال نہیں کی جاسکتی

مصنف نے اس کہانی میں لکھا ہے کہ جب بھی کوئی نسلی فسادات کسی بھی جگہ یا کسی بھی ملک میں نمودار ہوتا ہے اس وقت کسی بھی بات پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ جب تک امن بحال نہ ہوجائے۔ اس بات کا ذکر مصنف اس طرح لکھ رہا ہے۔

"میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں اور لاہور جل رہا ہے۔ محلّہ سرین کٹڑہ پوربیاں، بھائی اور دلی دروازے کے اندر ہندوؤں کے مکان، شاہ عالمی دروازہ اور پاپڑ منڈی سب جل کر راکھ ہو چکے ہیں۔ پاپڑ منڈی کی آگ میں سو سے زیادہ مکان جل گئے۔ آگ رات کے اڑھائی بجے، عین کرفیو کے وقت لگائی گئی جو بجھانے آیا پولیس کی گولی کا شکار ہوا۔ اتنی بڑی آگ لاہور نے کبھی نہیں دیکھی۔ اکبر منڈی۔ لاہور کی سب سے بڑی گیہوں کی مارکٹ پہلے ہی آگ کی نظر ہو چکی ہے۔

رہا پرانے شہر کے باہر کا علاقہ تو انارکلی میں اُلو بول رہے ہیں۔ سول لائنز سہمی سی لگتی ہے۔ امن ہے، لیکن ویسا ہی جیسا طوفان سے پہلے ہوتا ہے۔ مجسٹریٹ سے لیکر معمولی سپاہی تک فرقہ پرست ہوگئے ہیں۔ لاہور کا کام کاج ختم ہوگیا ہے۔ سوچتا ہوں، کسی طرح دونوں مکان بیچ کر بھاگوں۔ لیکن جائدادیں بڑی ہیں اور خریدنے والا کوئی نہیں۔ لوگ بھاگ رہے ہیں۔ شہر سے، سول لائنز سے، سنت نگر سے، رشی نگر سے، رام لور کرشن نگر سے، بھارت نگر اور ماڈل ٹاؤن تک سے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چند دنوں میں لاہور ہندوؤں سے بالکل خالی ہوجائے گا۔

''کہو بھائی یہ کاپی پنسل اٹھائے کدھر جارہا ہو۔''

سیٹھ ہرا مل کی سپیشل کا ٹیج سے نکل کر ۳۰ کے ہندسے کو بڑے فخر سے دیکھتا ہوا دینا ناتھ جو بلی وارڈ کی طرف جارہا تھا کہ قاسم کی آواز سن کر چونکا۔ اس کے سوال کا کیا جواب دے؟ اچانک وہ طے نہ کر پایا۔ بولا ''یہی کچھ پنجاب کے شرنارتھیوں کے لئے چندہ اکٹھا کرر ہا ہوں۔

''یہ بڑا اچھا کام کر رہے ہو تم'' قاسم بولا ابھی چار دن پہلے بمبئی کے ادیبوں اور آرٹسٹوں نے سارے شہر میں ریلی کی۔ تم نے شاید اخبار میں پڑھا ہو۔ پرتھوی راج اور نواب سب سے پہلے ٹرک میں ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے بارہ تیرہ ٹرکوں، (Trucks) میں بمبئی کے دوسرے مشہور ادیب، آرسٹٹ اور ایکٹر۔ عورت مرد، ہندو اور مسلمان دونوں تھے! ہندو مسلمان دونوں علاقوں میں گئے۔ ہندو مسلمان دونوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور فساد کے خلاف ان کے نعرے اور لکچر سنے ۔ میں تو خود چاہتا ہوں کہ اینٹی رائٹ فنڈ (Anti Riot Fund) کیلئے یہاں سے کچھ چندہ اکٹھا کر کے بمبئی کے آرٹسٹوں کی حوصلہ افزائی کو بھیجوں، کیونکہ شرنارتھیوں کو بچانے کی نسبت شانتی سے بستی ہوئی گرہستیوں کو شرنارتھی ہونے سے بچانا کم اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن یہاں کے لوگ مانتے نہیں۔ انہوں نے دیوالی پر موج منانے کے لئے ابھی تین سو روپیہ اکٹھے کئے ہیں۔ میں نے مہاتما گاندھی کے قول کا بھی حوالہ دیا کہ اس وقت جب لاکھوں آدمی بے گھر ہو کر در در بھٹک رہے ہیں، دیوالی کی خوشیاں اچھی نہیں لگتیں۔ کیوں نہ یہ تین سو روپیہ بمبئی کو دنگے فساد سے بچانے یا شرنارتھیوں کو کمبل بھجوانے کیلئے خرچ کئے جائیں۔ لیکن بھئی ایک پنجابی دوست نے تمہارے ملک کی کہاوت سنائی تھی۔ کوئی مرے کوئی جیے، ستھرا گھول بتاشے پیے۔ یہاں کے لوگ بھی اس ستھرے سے کسی طرح مختلف نہیں۔ تم نے بڑا اچھا کیا جو چپ

نہیں بیٹھے۔ میں آرٹسٹ ہوں، ملک کی اس مصیبت میں دوسرے دوستوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں لیکن مجبور ہوں۔ تم سینی ٹوریم چھوڑ چکے ہو تم آر ایم او کی اجازت لئے بغیر محض دوستی کے ناطے مریضوں سے چندہ اکٹھا کر سکتے ہو۔ چلو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ پانچ روپئے تم میرے نام لکھ لو"

ایک ہی سانس میں یہ سب کہہ کر قاسم اسے اپنے ساتھ اپنے وارڈ کی طرف لے چلا۔ لیکن بھئی میں تم سے صاف کہدوں میں تو پنجابی شرنارتھیوں کے لئے چندہ اکٹھا کر رہا ہوں۔ دینا ناتھ نے جھجھکتے کہا۔

"تو مجھے کیا اعتراض ہے، پنجاب سے آنے والے ہندو سکھ پناہ گزینوں کے دل میں بے حد غصہ ہونگے جب تک کہیں دوبارہ نہ بسیں گے۔ اپنے ہی جیسے بے قصور مسلمانوں کو تباہ کرنے سے باز نہ آئیں گے۔ ان کی مدد کرنا تو میں اپنے ہی بھائیوں کی مدد کے برابر سمجھتا ہوں۔"

اب دینا ناتھ کیا جواب دیتا، وہ چپ چاپ قاسم کے ساتھ اس کے وارڑ کی طرف چل پڑا۔

قاسم دینا ناتھ کو اپنے بستر کے پاس لے گیا اور چابی سے الماری کھول کر اس نے پانچ روپئے کا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

نوٹ لینے کے سوا دینا ناتھ کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے قاسم کا شکریہ ادا کیا اور چلنے کے خیال سے ہاتھ بڑھایا۔

اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اسے ذرا روک کر قاسم بھائی نے کہا "دیکھو دوست میرا کہا مانو تو اپنی اپیل کو ذرا سا بدل دو۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہندو مسلمان دونوں شرنارتھیوں کے لئے چندہ اکٹھا کر رہا ہوں۔"

"مسلمان شرنارتھی تو پاکستان چلے گئے۔"

''پھر کیا ہوا ابھی تو بہت سے باقی ہے''

''لیکن بھئی میں تو ہندوؤں ہی کیلئے چندہ اکٹھا کرر ہا ہوں تم مجھے اس صاف گوئی کیلئے معاف کرنا۔ تم میرے دوست ہو، اس لئے تم سے صاف صاف کہہ دیا۔ چاہو تو اپنے پانچ روپئے واپس لے لو۔''

یہ کہتے ہوئے دینا ناتھ نے نوٹ والا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

قاسم ہنسا ''شاید عام ہندوؤں کی طرح تمہیں بھی یہاں کے مسلمانوں سے کوئی ہمدردی نہیں ۔ اور ان کی مصیبتوں کو تم انہی کے گناہوں کا نتیجہ سمجھتے ہو لیکن میرے دوست انکا قصور ان معصوم بچوں کے قصور جیسا ہی ہے جو نہیں سمجھتے کہ ان کے بڑے انہیں کیا سکھاتے ہیں۔ عام لوگوں، خصوصاً اپنے ملک کے عام لوگوں اور بچوں میں کوئی فرق نہیں۔ مسلمان عوام کی بات چھوڑو تم ہندو عوام کی بات کرو۔ ایک وقت تھا کہ مہاتما گاندھی کی ٹھیک خواہش نہ جنتے ہوئے جنتا نے سبھاش بابو کو دوسری بار کانگریس کا صدر چنا۔ لیکن جب مہاتما گاندھی نے پٹابھی سیتارمیا کی ہار کو اپنی ہار کہا تو وہی سبھاش بابو دودھ کی مکھی کی طرح باہر نکال دیئے گئے۔ وہی لوگ ان کی برائی کرنے لگے جنہوں نے انہیں راشٹر پتی چنا تھا۔ ملک میں بے عزت ہو کر جان کی بازی لگا کر سبھاش بابو باہر چلے گئے اور انہوں نے آئی۔ این اے کی تنظیم کی اور وہی جنتا جس نے انہیں باہر نکلنے پر مجبور کیا تھا ان کی تعریفوں کے پل باندھنے لگی۔ پھر ایک وقت آیا جب اسی کانگریس کو انتخاب میں فتح حاصل کرنے کر کے انکا اور ان کی فوج کا ڈھنڈورا پیٹنا پڑا۔ تم اگر عوام میں جاؤ تو ان کی سادہ لوحی دیکھ کر حیران رہ جاؤ۔ اکثر کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان پر جو مصیبت ٹوٹی ہے اس میں عیسیٰ کے ان پیرو انگریزوں کا کتنا ہاتھ ہے۔ ۱۹۰۹ء میں انگریزوں نے ہندو مسلمانوں میں نفرت کا جو بیج بویا تھا وہی آج زہر یلا پیڑ بن کر اس دھرتی کو اپنی جڑوں سے زہر آلود بنا رہا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ

مسلمان کو ہندو سے لڑانے کی سیاست کا یہ کلائمکس ہے، پنجاب میں فساد کی آگ دہیں بھڑکی جہاں فوجی چھاونیاں تھیں اور انگریز حاکم تھے اگر کوئی غیر جانبدار ٹربیونل ان خونیں فسادات کی تحقیقات کرے تو دنیا کو پتہ چل جائے کہ شانتی کے پجاری، مہاتما عیسیٰ کے ان پیروؤں نے اپنے سامراج کی ضرورتوں کے پیش نظر کس سنگ دل فراست سے پنجاب میں لاکھوں ہندو مسلمانوں کا قتل کردایا ہے۔ لیکن جو ہوگیا، اسے واپس نہیں لایا جاسکتا۔ ہمارا ابھی فرض ہے کہ انگریز نے زہر کا جو درخت لگایا ہے اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں تا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی آزادی کے نو خیز پودے بے خوف وخطر بڑھیں پھولیں اور پھلیں یہ کام اتنا آسان نہیں، یہ میں جانتا ہوں لیکن ہمیں یہ تو معلوم ہونا چاہئے کہ اس عظیم مصیبت کے وقت ہمارا فرض کیا ہے۔

''وہاں کوئی مسلمان بچا یا مغربی پنجاب کے ہندوؤں کی طرح سب اجڑ گئے۔''

''سب تباہ ہوگئے'' بزرگ نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ تب پوشاک سے دینا ناتھ کو مسلمان سمجھ کر وہ اس سے اپنی مصیبت کی کہانی کہنے لگے۔

دینا ناتھ نے پاکستان میں ہندو سکھ عورتوں اور بچوں پر ہونے والے وحشیانہ مظالم کی باتیں سنی تھیں۔ کنواری لڑکیوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ ان کو ننگا کر کے نچایا گیا ۔ بوڑھیوں کی چھاتیاں کاٹ دی گئیں۔ ماں باپ کے سامنے ان کی بچیوں کے ساتھ زنا کیا گیا۔ بچوں کے سامنے ان کے ماں باپ کی گردنیں کاٹی گئیں۔ قتل، غارت گری اور خون ریزی کی دل دہلا دینے والی داستانیں سن کر دینا ناتھ کا خون خول اٹھا تھا۔ لیکن ان بزرگ سے جالندھر میں مسلمانوں کی تباہی کا حال سنتے سنتے دینا ناتھ کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ان میں سے کون سا ظلم تھا جو رام اور کرشن، نانک اور گوبند کے نام لیواؤں نے مسلمانوں پر نہیں توڑا۔ جب ان بزرگ نے بتایا کہ اسٹیشن کے پاس دو بڑے ہون کنڈ بنا رکھے تھے جن میں مسلمانوں کو بکروں کی طرح زندہ

جھونک دیا جاتا تھا اور برہمن انتقام کے دیوتا کہ یہ بلی دے کر جنونیوں کی طرح جے کار سے بلاتے تھے تو دینا ناتھ کیلئے کرسی پر بیٹھے رہنا مشکل ہوگیا۔ بے چینی سے وہ کمرے میں گھومنے لگا۔ ان بزرگ کے دو جوان لڑکے ایک لڑکی اور داماد، مختلف اذیتیں سہہ کر انتقام کی آگ کا شکار ہوئے تھے چھوٹا لڑکا کسی نہ کسی طرح پاکستان بھاگ گیا تھا۔ وہ خود بیوی اور بچی کے ساتھ دلی میں ایک حکیم سے مشورہ کرنے آئے ہوئے تھے۔ وہاں فساد ہوا تو کسی نہ کسی طرح تن کے کپڑے لے کر بمبئی پہنچے بیمار تو تھے ہی بمبئی کے ڈاکٹروں نے دق کا فتوئے دیا۔ کسی طرح مسلمان بھائیوں کی امداد سے پہنچ گئی آئے۔ ان کا لڑکا ان کی بیماری کی خبر پا کر پاکستان سے جان کو جوکھم میں ڈال کر بمبئی سے ہوتا ہوا پہنچ گئی پہنچا ہے۔

"انتقام کی آگ میں تن من جلتا ہے۔ دو مہینے سے ڈاکٹر مرچنٹ کے یہاں پڑے ہیں۔ صاحب قارون تو ہیں نہیں کب تک مدد کریں گے۔" اور یہ کہتے کہتے انہوں نے اپنے ماتھے کو ٹھونکا کہ جو خدا کو منظور ہے......

بات ختم کرتے کرتے بزرگ کی آنکھوں سے بیساختہ آنسو بہنے لگے اس وقت نہ جانے دینا ناتھ کو کیا ہوا کہ وہ سیٹھ ہیرا مل سے کیا گیا اپنا عہد بھول گیا جیب سے اس نے ایک کم پانچ سو کے نوٹ اور ریز گاری نکالی اور ان بزرگ کیسامنے چارپائی پر رکھ دی۔

بزرگ نے اپنی نم آلود آنکھیں حیرت سے اس کی طرف اٹھا دیں۔

"بابا میں ہندو ہوں۔ میرا گھر بار پاکستان میں لٹ چکا ہے۔ پاکستان میں رب العالمین پر یقین رکھنے والے مسلمانوں نے بے قصور ہندوؤں پر اور ہندوستان میں قدم قدم پر باسی بھگوان کے پیروؤں نے معصوم مسلمانوں پر جو مظالم توڑے ہیں ان کا کفارہ تو وہ سات جنم میں ادا نہیں کرسکتے۔ میری یہی دعا ہے کہ بھگوان انہیں نیک صلاح دے میں یہ چندہ پنجاب کے دکھی شرنارتھیوں کے لئے اکٹھا کر رہا تھا۔ آپ بھی

پنجاب کے شرنارتھی ہیں اور دکھی بھی کم نہیں ۔روپیہ زیادہ نہیں مگر دیکھئے اگراس سے آپ کا کچھ کام چل سکے۔''

اوراس سے پہلے کہ بزرگ کچھ کہتے ، دیناناتھ رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے باہر نکل آیا۔

اب مصنف کے دلائل سے یہ ثابت ہوا کہ ایک منتشر کرنے والی خبریں جو فرقہ واریت کے خلاف ہوں، اپنے دماغ سے مسترد کردینی چاہئیں۔ جب تک ماحول میں سکون ہونہ جائے۔سکون ہونے پر کوئی بھی شرارت آمیز واقعہ خود بخود ختم ہوجائیگا اور انسانی جذبے میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوگی۔

اُپندر ناتھ اشک نے بہت سی کہانیوں میں انسانی جذبہ اور انسانیت کیلئے بہت کچھ لکھا ہے اور جذبۂ انسانیت کو ہمیشہ کیلئے اپنی تحریر سے روشناس کیا ہے۔

اب یہ ثابت ہوا کہ اپندر ناتھ اشک کی تحریر میں انسانی جذبات کے ساتھ فرقہ وارانہ میل ملاپ کے جذبات بھی کہانی میں پائے جاتے ہیں جو کہ ہمیشہ ہر پڑھنے والوں کو ایک سنگ میل کی حیثیت سے یاد رہے گا۔



خواجہ احمد عباس کی کہانیاں
آج کل کے پورے عالمی حالاتوں کے موافق ہیں

خواجہ احمد عباس ایک بہت بڑے بلند پایہ نثر نگار ناول نگار اور افسانہ نگار اُردو زبان میں مانے جاتے ہیں۔ اِس قد آور شخصیت نے بہت سی ایسی کہانیاں بھی لکھی ہیں جس سے پڑھنے والے کو طرح طرح کی نصیحت فراہم ہوتی ہے۔ خواجہ احمد عباس نے بہت سی کتابیں لکھیں ہیں۔ بہت سی کتابوں میں انعام بھی ملا ہے۔ اِن کتابوں میں سے ان کی ایک کتاب ''دیا جلے ساری رات'' مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی نے چھاپی ہے۔ اس کتاب میں خواجہ احمد عباس نے کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس کا آپسی مقدمہ کرشن چندر کی قلم سے لکھا ہے۔ لیکن میں نے ایسے قدر آور شخصیت کی بہت سی کتابیں پڑھیں۔ پڑھ کر مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اس قدر آور شخصیت کا نثر یا کہانی آج

کل کے پورے عالمی حالاتوں کے موافق ہیں۔ جیسے کہ اسی کتاب میں جناب خواجہ صاحب نے ایک کہانی لکھی ہے۔ جس کا عنوان ''بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام'' ویسے تو عنوان بہت ہی لمبا ہے لیکن دلیل ایسی بتائی ہے جسے پڑھنے والے بہت ہی متاثر ہوتے ہیں اور یادداشت گاندھی جی کے اصولوں پر زیادہ الجھایا ہے۔ مختصر دلیل اس طرح ہے:۔

جب انگریزی سامراج کا دور ہندوستان میں اختتام پذیر ہوا تو اس وقت ایک نئے ملک کا وجود ہوا۔ جسے پاکستان کہتے ہیں۔ جب ملک کا بٹوارہ ہوا تو نسلی فسادات رونما ہوئے۔ اِن نسلی فسادات میں بہت سا نقصان لوگوں کو ہوا۔ خاص کر پنجاب، بنگال، بہار وغیرہ ریاستوں میں رونما ہوا اور ایسا فساد رونما ہوا کہ لوگ اپنی ریاست سے ہجرت کر کے دوسری ریاستوں میں چلے گئے۔ اپنی جنم بھومی کا خیال ہی نہیں کیا۔ مسلم اکثریت والے علاقوں سے مسلمان بھاگ کر پاکستان چلے گئے اور پاکستان سے ہندوؤں کی اکثریت بھاگ کر ہندوستان میں آ گئی۔ اس طرح سے مختلف نسل کے لوگ مختلف ریاستوں میں شرنارتھی بن کر کیمپوں میں ٹھہرے۔ یہ واقعہ رونما ہونے کے بعد خواجہ احمد عباس صاحب نے ایک کہانی لکھی۔ اس کہانی میں خواجہ احمد عباس نے یہ بتایا کہ جب فرقہ واریت روز بروز بڑھتی ہی گئی تو لوگوں میں مہاتما گاندھی کا احساس ابھرنے لگا اور وہ مہاتما گاندھی کو یاد کرنے لگے اور ان کی رُوح کو سکون فراہم کرنے کے لئے لوگوں نے بھائی چارہ کا پیغام اونچا کیا۔ اسی لئے خواجہ احمد عباس نے فرقہ وارانہ میل ملاپ پر یہ کہانی لکھی ہے کہ انور اور گوپال دو دوست مہاتما گاندھی کو خط ارسال کرتے ہیں۔

دونوں اپنے خط میں یہ گذارش کرتے ہیں کہ آپ (مہاتما گاندھی) جنت سے آ کر ہمارے درمیان امن بحال کرنے کے لئے لوگوں میں احساس پیدا کریں۔ انور

اور گوپال کو پوری توقع تھی کہ مہاتما گاندھی ضرور آئیں گے۔

اس خط میں واقعہ کلکتہ کا ذکر ہے جہاں نسلی فسادات زیادہ رونما ہوئے اور ساتھ میں مشرقی پاکستان (جو کہ مشرقی بنگال کے نام سے بھی مشہور ہے) کے نسلی فسادات کا بھی ذکر کیا۔ اس خط میں پنجاب کے نسلی واردات پر بھی ذکر کیا گیا۔ یعنی دونوں دوستوں نے اپنے مختلف خیالات کو لکھ کر گاندھی جی کے سامنے پیش کیئے۔

اب دونوں اس خط میں مہاتما گاندھی کو گذارش کرتے ہیں کہ وہ فوراً اس ملک میں نہیں آنا کیونکہ ابھی گاندھی جی کی جان کو خطرہ ہے۔

آگے خط میں یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو بھی ملک میں نسلی فسادات کو ختم کرنے کے لئے بہت سے کام انجام دے رہے ہیں۔

شیر علی ایک آدمی اپنا مکان بیچ کر پاکستان کی طرف دوڑتا نظر آرہا ہے۔

نسلی فسادات کو روکنے کیلئے محلّہ والوں نے امن کمیٹی تشکیل دی ہے۔ اس خط میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ شیر علی اور پیر علی کہ لڑکے ہندوستانی سکول میں اپنا داخلہ مسترد کر کے پاکستان کی طرف جارہے ہیں۔

انور اور گوپال اپنے اپنے ہندوؤں اور مسلمان بھائیوں کو الگ الگ باتیں بتا کر فتنے والی کہانیاں سنا رہے ہیں۔

گوپال بھیشم سے کہتا ہے کہ شیر علی کے لڑکے سے باتیں نہیں کرنا وہ پاکستان جارہے ہیں لیکن بھیشم کہتا ہے کہ وہ ہماری جماعت کا ہے دوستانہ ترک نہیں کر سکتے۔

آگے لکھ کر یہ بتاتے ہیں کہ گاندھی جی کو لکھا کہ شرنارتھیوں کے لئے کھانے پینے کے گودام بنائے گئے ہیں۔ یہ بھی لکھا کہ ابھی نسلی فسادات ختم نہیں ہوئے ہیں۔ تشریف لانا مناسب نہیں۔ خط کے جواب کا انتظار ہے۔

آخر میں انور اور گوپال مہاتما گاندھی جی سے گذارش کرتے ہیں کہ خط کا جواب

ضرور دینا۔ انور یہ کہہ کر خط کو آخری شکل دے کر بتا رہا ہے کہ اُس کی نانی جنت سدھار گئی وہ پردہ کرنے والی عورت نہیں تھی، وہ آپ سے ضرور ملے گی۔ ان سے کہنا کہ انور بھی ڈھونڈتا ہے۔

اوپر کے خط سے ہمیں نصیحت ملتی ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے ملک میں کتنی غلطیاں رونما ہوئی۔ لیکن پھر بھی بھائی چارہ برقرار رہا۔ اس طریقہ سے مصنف نے ہمیں نصیحت دی ہے کہ نسلی فسادات کے دوران کسی نہ کسی طریقے سے بھائی چارہ ہی بہت اچھا رہتا ہے۔ ایک دوسرے سے نفرت کرنا بہت ہی غلط ثابت ہوتا ہے۔ خدا ایک ہے لیکن راستے الگ الگ ہیں۔ لیکن الگ الگ راستوں سے جا کر پھر ایک ہی راستے میں ملاپ ہوتا ہے۔

بابائے قوم مہاتما گاندھی

میرے خیال میں مصنف اس کہانی میں یہ نصیحت دے رہا ہے کہ جب کبھی اس ملک میں کسی قسم کی غلطیاں رونما ہوتی ہیں تو اس وقت ہم بابائے قوم کو یاد کرتے ہیں اور اس کی سمادھی پر فریاد کرتے ہیں۔ لیکن اس سے بہتر یہی ہے کہ فریاد کرنے سے پہلے ہمیں انسانی اصولوں پر چلنا چاہئے۔ اور فرقہ پرست قوتوں کو دفن کر دینا چاہئے۔ مہاتما گاندھی کی سمادھی پر جا کر ہمیں پہلے ان کے اصولوں کو پڑھنا چاہئے۔ بھوک ہڑتال کرنے سے پہلے ہمیں گاندھی وادی اصولوں کا خود امتحان لینا چاہئے۔ جب ہم گاندھی کے اصولوں کو اپنائیں گے تو کوئی بھوک ہڑتال کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں منصف اس چٹھی کو سمجھانے کیلئے لوگوں کو بتا یا رہا ہے کہ اگر ہم آپسی بھائی چارہ ترک نہیں کرتے اور دشمن کے باتوں پر توجہ نہیں دیتے تو کس طرح مشرقی بنگال کے ہندو گھرانے مغربی بنگال میں شرنارتھی بن کے بس جاتے۔

اسی طرح مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ پنجاب میں نسلی فسادات کی حالت کبھی پیدا نہیں ہوتی اگر لوگوں میں آپسی بھائی چارہ قائم دائم رہتا۔
منصف نے چٹھی کو کہانی کی صورت میں لوگوں کو سمجھانے کے لئے لکھی ہے۔
تا کہ آئندہ کے لئے ملک میں کوئی نسلی فسادات رونما نہ ہو۔

شرنارتھی کیمپوں کی حالت

میرے خیال سے مصنف نے اس چٹھی میں شرنارتھی کیمپوں کی حالت بتاتے ہوئے یہ نصیحت دی ہے کہ جب کوئی نسلی فسادات رونما ہوتے ہیں جس کی وجہ سے متاثرین لوگ کیمپوں میں ٹھہرتے ہیں تا کہ آئندہ اُن کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ یعنی امن میں رہنے کے لئے کیمپوں میں ٹھہرتے ہیں۔ مصنف اِس چٹھی میں یہ نصیحت پڑھنے والے کو دے رہا ہے کہ اگر نسلی فسادات رونما نہیں ہوتے تو یہ لوگ اپنے اپنے گھروں میں امن سے زندگی بسر کرتے۔ لیکن اگر کسی نے نسلی فسادات میں حصہ لیا تو ان کو عبرتناک سزا ملنی چاہئے تا کہ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ آئندہ ایسے فسادات ملک میں رونما نہ ہوں۔

عوام میں ملکی مفادات

میرے خیال میں مصنف اس چٹھی میں یہ بھی بتا رہے ہیں کہ ملکی مفادات کے لئے بھائی چارہ رکھنا لازمی ہے اور اس کو قائم رکھنے کے لئے کسی بھی ریاست سے ہجرت نہیں کرنی چاہئے۔ مصنف یہ بات اس وقت لکھتا ہے جب لوگ مشرقی بنگال سے ذات پات کے نام پر بھاگتے ہیں۔ اگر ذات پات کے نام پر نہ بھاگتے تو نسلی فسادات رونما ہی نہیں ہوتے۔ عوام میں ملکی مفادات کا رُجحان دماغ میں زیادہ رہنا چاہئے۔ اگرچہ کوئی پنجابی ہے تو اسے یہ نہیں سوچنا چاہیئے کہ وہی صرف پنجابی ہندو ہے

بلکہ اُس کو یہ سوچنا ہے کہ اس کے ساتھ اور بھی بھائی ہیں خواہ وہ مسلمان ہو، یا سکھ ہو، یا عیسائی۔ یہ بھی نہیں سوچنا چاہیئے کہ کسی خاص نسل سے تعلق رکھنے والا ہی اس کی زبان کا حقدار ہوسکتا ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی کو اس زبان کو سیکھنے کا حق برابر ہے۔

یہ نصیحت خواجہ احمد عباس نے پڑھنے والوں کو دی ہے کہ ہمیں ملکی مفادات کا خیال رکھنا چاہیئے اور مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے اصولوں پر ہمیشہ کاربند رہنا چاہیئے۔ اسی لئے اگر ہم ان اُصولوں پر کاربند رہیں گے تو ملک میں دِن دوگنی اور رات چوگنی ترقی ہوسکتی ہے۔ اورلوگ امن سے زندگی بسر کر کے ملکی مفادات کے لئے کام کریں گے۔ اسی لئے میں یہ دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ خواجہ احمد عباس کا خیال "آج کل کے مکمل عالمی حالات کے موافق ہے"۔

ایک مضمون دو مصنف

میں غور و فکر کر کے اس بات پر پہنچا کہ خواجہ احمد عباس اور اُپندر ناتھ اشک کے خیالات ایک دوسرے سے کافی حد تک ملتے جلتے ہیں اور دونوں میں فرقہ وارانہ میل ملاپ اور ملکی مفاد کے جذبات قائم ودائم ہے۔ اُن کی تحریر انسانی جذبات کے موافق ہے۔ اُپندر ناتھ اشک نے کہانی 'ٹیبل لینڈ' لکھی ہے اور اسی کتاب میں ایک مختصر کہانی بھی لکھی ہے۔ اسی طرح سے خواجہ احمد عباس کی کہانی ''بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام'' یہ بھی فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف لکھی گئی ہے۔

اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اگر ان دونوں منصفوں نے فرقہ وارانہ میل ملاپ کے لئے کہانیاں لکھی ہیں تو یہ کیسے ثابت کریں کہ ایک مضمون دو منصف۔ اُپندر ناتھ اشک فرقہ وارانہ فسادات کے واقعہ پر دینا ناتھ کو کردار بنا کر یہ نصیحت دے رہا ہے کہ جوش میں ہوش بھی رکھنا لازمی ہے۔ اگرچہ دینا ناتھ کو اسکا بھائی لاہور سے خط بھیج رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ ہندو محلوں کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ پھر مصنف نے اسی کہانی میں یہ بتایا کہ جب دینا ناتھ قاسم سے ملتا ہے اور قاسم اس سے وضاحت کر کے یہ بتاتا ہے کہ جتنے ہندو فتنہ و فساد کے شکار ہوئے اتنے ہی مسلمان بھی شکار ہوئے ہیں۔ یہ خبر دے کر دینا ناتھ مطمئن ہوا۔ جب دینا ناتھ چندہ جمع کرنے مسلمانوں کے پاس جاتا

ہے تو وہاں پر مسلمانوں کی حالت دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ واقعی یہ بھی نسلی فسادات سے متاثر ہوئے ہیں۔ پھر اپنا چندہ انہیں کی امداد کے لئے سپرد کر دیتا ہے۔

اسی طرح سے خواجہ احمد عباس نے اپنی کہانی ''بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام'' میں لکھا کر پڑھنے والوں کو نصیحت دی ہے کہ نسلی فسادات کو کبھی اُبھرنے نہیں دینا چاہیئے۔ میرے خیال میں خواجہ احمد عباس یہ نصیحت دے رہا ہے کہ لوگوں کو کبھی تنگ نظریہ کے خیالات نہیں رکھنے چاہیئے اور ایک دوسرے میں مذہبی رواداری برقرار رکھنی چاہیئے۔ مذہبی رواداری کو فرقہ واریت میں شامل نہیں کرنا چاہیئے۔ بلا لحاظ مذہب وملت بھائی چارہ ہی ایک اہم امن کا علاج ہے۔

اب میں یہ ثابت کر رہا ہوں کہ اس مضمون میں بھی خواجہ احمد عباس انور اور گوپال کی مثال دے کر ہمیں یہ نصیحت دے رہا ہے کہ کس طرح دو دوست اس ملکی فسادات کے خلاف مہاتما گاندھی کے اصولوں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ تاکہ لوگوں میں بھائی چارہ قائم ودائم رہے۔ مصنف خط کے لہجے میں ہندوستان اور پاکستان کے نسلی فسادات پر ہمیں نصیحت دے رہا ہے کہ ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لئے کسی بھی فرقہ واریت کے اصولوں پر نہیں چلنا چاہیئے۔ انسانی جذباتوں اور مہاتما گاندھی کے اصولوں پر چلنا یہی ہمارا لائحہ عمل ہونا چاہیئے۔

اوپر کے واقعات سے ہمیں معلوم ہوا کہ دونوں منصف کے مضامین کا مرکزی خیال ایک ہی ہے۔ اپندر ناتھ اشک کی کہانی ''ٹیبل لینڈ'' اور خواجہ احمد عباس کی کہانی ''بچوں کے خط مہاتما گاندھی کے نام'' دونوں میں نسلی فسادات کے خلاف اور فرقہ واریت کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے۔ اِن دونوں کہانیوں کو جوڑ دینے کے بعد خود بخود محقق و دیگر ادیب تسلیم کریں گے کہ ایک مضمون کے دو مصنف۔ اُیک نے ایک طریقے سے اور دوسرے نے دوسرے طریقے سے ایک ہی نصیحت کی ہے۔



ٹھاکر پونچھی کی کہانی

غریبوں، بے سہاروں کی ترجمانی

ٹھاکر پونچھی اردو ادب میں ایک اچھے افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور کہانی کار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے ریڈیو ڈرامہ ترتیب دیئے ہیں اور انہیں پیش بھی کیا ہے۔ ٹھاکر پونچھی کی کتاب ''زندگی کی دوڑ'' ایک بہت ہی اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب مکتبہ آشیانہ قرول باغ نئی دہلی نے چھاپی ہے۔ اس میں ٹھاکر پونچھی نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ جن میں سے اُن کی کہانی ''موت کے سائے تلے'' جو کہ کل ہند مقابلے کی انعامی کہانی ہے۔ اسی طرح سے بہت سی کہانیاں اس کتاب میں تحریر کی ہیں۔ انہی کہانیوں میں ایک کہانی 'فاصلہ' بہت ہی بہترین کہانی ہے۔ مختصر دلیل ملاحظہ فرمائیں۔

کلپنا ایک لڑکی غریب گھرانے میں پیدا ہوئی۔ جھونپڑی میں رہتی ہے۔ باپ کا سایہ بچپن میں ہی چھین گیا۔ اب اس کی ماں اور بھائی ہیں۔ اس کی ماں گھر کے گزارا کے لئے ایک کارخانے میں کام کرتی ہے۔ تیس روپئے ماہوار تنخواہ ملتی ہے، کلپنا کی ماں تیس روپئے پر ہی گھر کا گزارا کرتی ہے۔ کلپنا کا بھائی اچانک خطرناک بیمار پڑتا ہے۔ اب دوائی کے لئے پیسے نہیں، مہنگی دوائی تنخواہ کم یہ اِس غریب کنبہ کے لئے خطرے کا باعث بنا۔ اسی لئے کلپنا کی ماں نے دوسرے آدمی کا ساتھ مانگا۔ وہ آدمی دوسری جھونپڑی میں رہتا ہے لیکن محلّہ ایک ہی ہے۔ اسی آدمی کے توسل سے کلپنا کی ماں اپنے بیٹے کی دوائی کے لئے امداد حاصل کرتی ہے۔ کلپنا کی ماں اس آدمی سے پیسے وصول کرکے بچے کا علاج ومعالجہ کراتی ہے۔ اب کلپنا کی ماں اپنی لڑکی کی شادی اسی آدمی کے ساتھ کرنے کے لئے مجبور ہوگئی۔ جب شادی رچائی گئی تو محلّہ میں کوئی رونق ہی نہیں، ہمسایوں کو معلوم ہی نہیں کہ کلپنا کی شادی اس آدمی کے ساتھ ہوئی ہے۔ جب شادی ہوئی تو کلپنا بہت ہی خوش ہوئی۔ اچھی طرح سے گزارا چلتا رہا۔ اس کے بعد کلپنا کا آدمی دس پندرہ دن کے لئے اپنی جھونپڑی سے غائب ہوتا ہے۔ کلپنا ڈھونڈنے کے لئے تلاش کرتی ہے۔ دس پندرہ دن کے بعد کلپنا کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ گاؤں گیا ہے۔ اور وہیں اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ سن کر کلپنا واپس اپنے ماں کے پاس چلی آتی ہے۔ جب ماں کلپنا کو دیکھتی ہے تو اندر ہی اندر غم محسوس کرتی ہے اور کلپنا کو کچھ نہیں بتاتی ہے۔ اس عرصے میں کلپنا کا بھائی اور اسکی ماں اس دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

جب اس جھونپڑی میں کسی آدمی نے شادی رچائی تو ایک بوڑھے آدمی نے رونے کی آواز سنی۔ وہ برابر والی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ جب ماتم کی آواز سنی تو کسی نے بوڑھے سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ بوڑھے نے جواب دیا کہ کلپنا کی ماں اس

دنیا سے چل بسی۔ اس کے بعد یہ آدمی کلپنا کی جھونپڑی میں جاتا ہے۔ وہاں کلپنا کے ساتھ افسوس بھی کرتا ہے اور کلپنا سے یہ گذارش کرر ہا ہے کہ انہیں شادی ضرور کرنی چاہیئے ۔ کلپنا احوال سنا کے کہتی ہے کہ اُسے اب شادی کا ارادہ نہیں ہے۔ یہ سوچتے سوچتے کلپنا سڑک پر نکل جاتی ہے۔ اچانک لاری کے زد میں آتی ہے اور موت کا شکار ہو جاتی ہے۔ جب اس کو چتا پر جلاتے ہیں تو کلپنا کی صورت دیکھ کر لوگ محسوس کرتے ہیں کہ کلپنا کا چہرہ خوش نظر آتا ہے۔ چہرے سے معلوم ہوتا ہے جیسے کلپنا کسی سے خوشی سے ملنے جاتی ہے۔

اب میں اوپر لکھی ہوئی مختصر کہانی کے بارے میں اپنی رائے لکھتا ہوں:

میرے خیال میں منصف اس کہانی میں بہت سی نصیحتیں پڑھنے والے کو فراہم کرتا ہے۔ جیسے کہ

سماجی روایت

مصنف نے اس کہانی میں سماجی روایت کا ذکر کیا ہے۔ سماج میں بزرگ آدمی اپنے چھوٹے بچوں کو کس طرح عزت اور احترام دیتے ہیں۔ اسی طرح سے چھوٹے کس طرح بزرگوں کا احترام کرتے ہیں۔ ٹھاکر پونچھی نے اس کہانی میں یہ ذکر کیا ہے کہ جھونپڑی کے باہر ایک جوان لڑکی اور لڑکے کو گرمیوں کے دن میں سلاتے ہیں اور ایک بوڑھا آدمی ان کی جوانی کے لئے جھونپڑی میں سوتا ہے۔ وہ ان بچوں کی خوشی کے لئے گرمی برداشت کر کے اپنے آرام کی قربانی دیتا ہے۔ اس طرح یہاں کے لوگ عمر کا لحاظ کئے بنا ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ اس دور میں بجلی کے پنکھے ہونے کے باوجود لوگ اس طرح کی قربانی دینے سے قاصر ہیں۔ اسی لئے مؤرخ اس کہانی کو تاریخ کے ساتھ بھی جوڑ سکتا ہے۔

موت آتی ہے ضرور

مصنف نے اس کہانی میں یہ بتایا ہے کہ ایک غریب بیوہ نے اپنے بیٹے کے صحت یابی کے لئے اپنی لڑکی کی شادی کسی غیر آدمی کے ساتھ کی۔ ایک غریب کنبہ اپنی صحت یابی کے لئے کن کن مشکلاتوں سے گزرتا ہے۔ جیسے کہ کلپنا کی شادی رچائی گئی لیکن پھر بھی اس کے آدمی نے دھوکہ دیا اور اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ماں اور بھائی کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان سب حالات سے کلپنا بہت زیادہ پریشان ہوگئی۔ ان حالاتوں میں کلپنا کا موت ہی ایک علاج تھا لیکن موت نے اسے ایسے بے رحم طریقے سے چھینا جس سے ہمدردی جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر چہ لاری کے زد میں آکر کلپنا اس دنیا سے چل بسی لیکن چتا پر اس کا چہرہ دیکھ کر لوگ حیران ہوئے۔ کلپنا کا چہرہ بہت ہی کھلا دکھائی دیے رہا تھا جیسے کہ وہ کسی سے ملنے کے لئے جا رہی ہے۔ خیر مصنف نے موت کا ذکر صحیح کیا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس دنیا میں کسی کو بھی ہمیشہ نہیں رہنا ہے۔ کسی نہ کسی دن اس دنیا سے رخصت ہونا ہی ہے۔

غربت کے ماحول میں

ٹھاکر پونچھی اس کہانی میں یہ بتا رہے ہیں کہ جھونپڑی میں کس قسم کا ماحول پایا جاتا ہے۔ اگر چہ لوگ جھونپڑی میں رہتے ہیں۔ لیکن غریبی کی حالت میں بھی انکا رہن سہن سادہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کی عزت کرنا انکو بخوبی آتا ہے۔ جب ماتم کی آواز آتی ہے تو ایک آدمی تحقیق کرتا ہے کہ یہ رونا کہاں ہو رہا ہے۔ تو بوڑھا آدمی جواب دیتا ہے کہ کلپنا کی ماں مر گئی۔ یہ سن کر جھونپڑی میں رہنے والے ہمدردی دکھانے کے لئے کلپنا سے ملتے ہیں۔ لیکن مصنف نے یہ نہیں بتایا محلہ والے کس قسم کا ہمدردانہ رویہ کلپنا کے ساتھ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں مصنف یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اگر

غربت نہیں ہوتی تو کلپنا کے بھائی کی بے وقت موت نہیں ہوتی۔اسی طرح سے اگر کلپنا کی ماں کی معاشی حالت بری نہ ہوتی تو وہ کلپنا کی اس غیر آدمی کے ساتھ شادی کیسے رچاتی۔ کیا اِس دنیا میں کلپنا کو دھوم دھام سے شادی رچانے کا حق نہیں تھا۔ مصنف صحیح کہہ رہا ہے کہ غربت کے ماحول میں ایک غریب آدمی کی حالت بری دیکھائی دیتی ہے۔اگر کلپنا کی ماں کی معاشی حالت اچھی ہوتی تو وہ جھونپڑی میں اپنی زندگی بسر نہیں کرتی۔

میرے خیال میں ٹھاکر پونچھی صاحب نے اپنی کہانی میں غریبوں کے معاشی، سماجی، گھریلو اور ذاتی حالات کے بارے میں زیادہ ذکر کیا ہے اور اس کو پڑھنے سے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ غربت کے حالات سے ہی تنگ آ کر انسان بہت کچھ برائی بھی کرسکتا ہے۔

تاریخی منظر

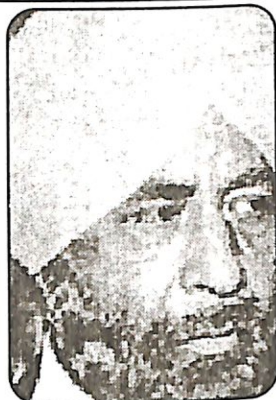
میرے خیال میں جب ٹھاکر پونچھی نے یہ کہانی اپنے ماحول کے مطابق لکھی کی ہے۔تب سے اب تک ماحول میں بہت بدلاؤ آیا ہے۔ بہت کم لوگ جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ ان دِنوں معاشی حالت بہت ہی بدترین رہی۔ میرے خیال میں اگر ہم اس کہانی کو تاریخی پس منظر میں دیکھیں تو ہم مختلف میدانوں میں کثرت سے تبدیلیاں دیکھیں گے۔

عنوان کے لحاظ سے صحیح ہے یا غلط

ٹھاکر پونچھی نے اس کہانی کا عنوان ''فاصلہ'' لکھا ہے۔ میرے خیال سے ''فاصلہ'' عنوان بہتر نہیں ہے۔ مانتے ہیں منصف نے کلپنا کا کردار اسی کہانی کے مطابق لکھا ہے۔ کلپنا مختلف حادثات سے گزر کر چند ہی دِنوں میں اس دنیا سے

رخصت ہو جاتی ہے۔ مصنف نے یہ صحیح لکھا ہے کہ کلپنا کے لئے ہر ایک حادثہ موت کے برابر ہے۔ ایک کے بعد دوسری موت اور دوسری موت کے بعد تیسری موت۔

میرے خیال میں اگرچہ کہانی کو غور و فکر سے پڑھیں گے تو ٹھاکر پو پنچھی نے عنوان صحیح تجویز نہیں کیا ہے۔ وہ یہ کہ اس کہانی میں میں نے بہت سے دلائل پیش کیے اور مصنف کا رجحان بھی بتایا اس لحاظ سے ''فاصلہ'' عنوان مناسب نہیں ہے۔ اس کہانی کا عنوان تحقیقی اور تنقیدی نگاہ سے ''رہا حالِ غربت میں'' ہونا چاہیئے۔



راجندر سنگھ بیدی کے افسانے

''آج کل کے معاشی حالت کے مطابق''

راجندر سنگھ بیدی نے منشی پریم چندر اور کرشن چندر جیسے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ اپنا ادبی کارنامہ بھی اردو ادب میں پیش کیا۔ ہم بیدی کو کبھی نہیں بھول سکتے ہیں۔اس قد آور شخصیت کا نام اُردو ادب میں تا ابد زندہ رہے گا۔''راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے'' کی کتاب ڈاکٹر اظہر پرویز نے تدوین کی ہے۔ یہ کتاب ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے ۲۰۰۶ء میں شائع کی ہے۔

اِن افسانوں میں سے ایک افسانہ ''گرم کوٹ'' بھی ہے۔ جناب راجندر سنگھ بیدی صاحب کے افسانہ کا اقتباس لکھ رہا ہوں:

شمی کا خاوند ایک معمولی سا ملازم ہے جو کسی محکمے میں کام کرتا ہے۔ دسمبر کے مہینے

میں وہ پرانا کوٹ پہنتا ہے کیونکہ وہ سردی سے بچنا چاہتا ہے۔لیکن پہنتے وقت جب اس کوٹ کی حالت دیکھتا ہے تو اپنی معاشی حالت پر نظر ثانی کرتا ہے۔کوٹ کی جیبوں حالت کی دیکھ کر پریشان حال ہوجاتا ہے۔کوٹ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا نظر آتا ہے۔جیب میں جب ہاتھ ڈال کر روپئے کو تلاش کرتا ہے۔لیکن روپئے ہاتھ میں نہیں آتے۔پھٹی ہوئی جیب کی وجہ سے ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایک دِن جیب میں دس روپئے کا نوٹ رکھا اور تلاش کرنے پر ہاتھ میں نہیں آیا۔شمی کا خاوند ایک دن درزی کی دکان کے سامنے سے گزرا۔وہاں مختلف قسم کے کوٹ دیکھے۔دیکھ کر محسوس ہوا کہ میں بھی کوئی کپڑا لاؤں اور درزی سے نیا کوٹ سلاؤں۔لیکن بری معاشی حالت ہونے کی وجہ سے یہ ارادہ ترک کردیا۔

شمی کے خاوند نے کئی مرتبہ اپنی بیوی سے یہ گذارش کی کہ اس کوٹ کی جیبوں کو ٹھیک کیا جائے۔جب شمی نے کوٹ کی مرمت کی تو وہ تھک گئی کہنے لگی پھٹا ہوا کوٹ کتنی بار سوئی سے ٹھیک کروں۔شمی کی تھکاوٹ خاوند کو بھی محسوس ہوی۔ایک دن شمی کے خاوند نے گیلی لکڑی جلائی اور شمی کو یہ لکڑی جلاتے جلاتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔اس بات پر شمی کے خاوند کو بہت ہی ترس آیا اور محسوس ہوا کہ غربت کی وجہ سے کتنا برا حال دیکھنا پڑتا ہے۔کبھی کبھی گھر میں شمی کے خاوند سے اسکے بچے گذارش کرتے کہ بازار سے رسگولہ لانا،کوئی بچہ ٹرائے سائیکل کی مانگ کرتا۔لیکن شمی کے خاوندان مانگوں کو پورا نہ کرسکا۔ایک دِن شمی کا خاوند کلب میں دیر تک جواری کے ساتھ جوا کھیلتا رہا۔شمی کے خاوند کو پورا یقین تھا کہ وہ دس پندرہ بخشش کے طور پر عطا کریں گے۔لیکن کچھ بھی روپئے نہیں ملے۔شمی کے خاوند کو ایک دن شراب کی محفل میں بھی شراب پینے پر مجبور کیا گیا۔لیکن شمی کے خاوند نے پینے سے انکار کیا اور یہ محسوس کیا کہ اس برائی سے بچنا چاہئے کیونکہ اپنی آمدنی کے لحاظ سے یہ برائی نہیں لگنی نہیں

چاہیئے۔ لیکن کلب میں شراب کے ماحول کی وجہ سے ایک آدمی نے شمی کے خاوند کو تھوڑی سی پینے پر مجبور کیا۔ گھر واپس جانے پر شمی کا خاوند ڈرنے لگا کہ شراب کی بو گھر والوں کو معلوم نہ ہو جائے۔ شمی کا خاوند ایک حلوائی کے پاس گیا اور وہاں پر قسم قسم کی مٹھائیاں دیکھ کر یہ تہیہ کیا کہ میں بچوں کے لئے مٹھائی ضرور خریدونگا۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے حلوائی سے یہ گذارش کی کہ وہ اسے ایک مٹھائی دوکان پر ہی کھلائے۔ وہ کھا کر شمی کا خاوند جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ بدقسمتی سے پیسے ہاتھ میں نہیں آئے۔ یہ دیکھ کر حلوائی نے شمی کے خاوند کو کہا کہ دو تین دن کے بعد پیسے وصول کروں گا۔ یہ سن کر شمی کا خاوند گھر پہنچا۔ شمی کے خاوند نے جیب میں رکھا ہوا دس روپئے کا نوٹ شمی کے حوالے کیا۔ شمی نے خاوند سے کہا کہ وہ بازار سے ان روپئوں سے کچھ نہ کچھ گھر کے لئے لائے گی۔ اس دِن شمی کا خاوند بچوں کے ساتھ بیٹھا اور بچوں کو یہ یقین دلانے لگا کہ ان کی ماں بازار سے رسگولے اور ٹرائے سائیکل بھی خریدے گی۔ یہ سن کر بچے خوش ہو گئے۔ جب شمی بازار سے آئی تو اس کے ہاتھ میں کوٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بچے کہنے لگے نہ رسگولہ اور نہ ٹرائے سائیکل، شمی یہ بات سن کر بچوں کو تھپڑ مارا۔

آخر کار شمی نے یہ محسوس کیا کہ اتنی کمائی کر کے وہ خاوند کے لئے کچھ نہ لا سکی۔ پھٹا ہوا کوٹ سماج میں بہت ہی برا لگتا ہے۔ اسی لئے اس نے کوٹ کو پہلی ترجیح دے کر اپنے خاوند کو خوش رکھنے کیلئے پکا ارادہ کیا۔

مصنف نے اوپر کے دلیل دے کر اس افسانہ میں بہت سی نصیحتیں فراہم کی ہیں۔ لیکن پڑھنے والوں کو خود اندازہ لگانا چاہیئے کہ راجندر سنگھ نے بیدی نے اس افسانے میں کس طرح سے ایک غریب تنگ دست یعنی کمزور معاشی حالت سے گزرنے والی زندگی کے بارے میں لکھا ہے۔

سجاوٹ ہے دکان میں

مصنف نے اس افسانے میں یہ بیان کیا ہے کہ کپڑوں سے سجی ہوئی درزی کی دوکان کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن جیب خالی ہونے کی وجہ سے کوئی امید ہی نظر نہیں آتی کہ کبھی کوٹ بھی پہن سکتے ہیں۔

میرے خیال میں منصف نے یہ تذکرہ کیا ہے کہ جب کوئی غریب کسی دوکان کے سامنے گزرتا ہے تو وہاں پر وہ بہت سی چیزوں کو دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ میں بھی ان چیزوں کو خریدوں لیکن جیب خالی ہونے کے وجہ سے کوئی بھی چیز خرید نہیں سکتا اور ایک تماشہ بین بن کر صرف تماشہ ہی دیکھ سکتے ہیں۔

سستا روئے بار بار مہنگا روئے ایک بار

راجندر سنگھ بیدی اس افسانے میں یہ بتا رہا ہے کہ غریب کو جب پیسے حاصل ہوتے ہیں تو وہ کم قیمت والے چیز کو پسند کرتا ہے۔ جیسے کہ اس افسانے میں شمی اپنے خاوند سے کہتی ہے کہ گیلی لکڑی تیز نہیں جلتی ہے جس سے دھواں ہی دھواں محسوس ہوتا ہے اور آنکھیں بھی اندھے جیسے محسوس ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں مصنف یہ بتا رہا ہے کہ اگر سوکھی لکڑی ہوتی تو آنکھیں دھواں کی وجہ سے بند نہیں ہوتیں۔ اسی لئے مصنف یہ بتا رہا ہے کہ کبھی بھی غریبی میں زندگی بسر نہیں کرنی چاہئے لیکن معاشی حالت برے ہونے کی وجہ سے غربت میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔

غربت میں بچوں کی حالت

منصف اس افسانے میں یہ بتا رہا ہے کہ غریب بچوں کا رہن سہن بہت ہی خراب ہوتا ہے۔ جیسے کہ بچے اپنے ماں باپ سے گذارش کرتے ہیں کہ انہیں رسگولے کی

مٹھائی منگوائی جائے اور ٹرائے سائیکل کھیلنے کے لئے مہیا کی جائے۔ میرے خیال میں راجندر سنگھ بیدی نے اس افسانے میں اگر اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک امیر بچہ ان باتوں سے محروم نہیں رہتا ہے۔ اس کے گھر والے رسگولے کھلا کے خوش کرتے ہیں اور ٹرائے سائیکل بھی مہیا کرتے ہیں۔

اسی لئے راجندر سنگھ بیدی اس افسانے میں یہ بتا رہے ہیں کہ معاشی حالت بری ہونے کی وجہ سے بچوں کو وہ سامان مہیا ہی نہیں ہوتا جو سامان امیر بچوں کے لئے مہیا ہوتا ہے۔

بُری محفل سے الگ تھلگ

راجندر سنگھ بیدی اس افسانے میں یہ بتاتے ہیں کہ شمی کا خاوند جب کلب میں اپنی حاضری دیتا ہے تو وہاں اسے کئی جواری جوا کھیلتے نظر آئے لیکن جیت کن کی ہوگی اور ہار کن کی ہوگی شمی کا خاوند یہ نہ جانتے ہوئے، جیت والوں سے کچھ پیسہ وصول کرنے کیلئے بیٹھا ہے۔ اگر چہ بری محفل ہے لیکن اس بری محفل سے غریب آدمی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ دوسری بات مصنف اس افسانے میں یہ بھی بتا رہا ہے کہ جب شمی کے خاوند کو شراب کی محفل میں شرابی پلانے کے لئے مجبور کرتے ہیں لیکن وہ اس بری چیز سے نفرت کرتا ہے پھر بھی محفل میں شمی کے خاوند کو تھوڑی سی پینے پر رضامند کر لیتے ہیں۔

میرے خیال میں مصنف نے یہ بیان کیا ہے کہ امیر آدمی ایک کلب میں جوا کھیلتے ہیں۔ کلب میں شراب پیتے ہیں۔ تو کیوں نہ اس قسم کے پیسے کو اچھے کاموں میں لگایا جائے تاکہ اس نشے کے بدلے دعا ہی حاصل ہو۔ مصنف اس افسانے میں ہمیں اس بات کا بھی احساس دلاتا ہے کہ اگر شمی کا خاوند امیر ہوتا تو وہ بھی شاید ان عیش و عشرتوں

سے مبرا نہیں ہوتا۔ لیکن غربت کے وجہ سے ان عیش و عشرتوں کو بھول کر غربت کی زندگی گزارتا ہے۔

اپنے خاوند کا پیار ہمیشہ کیلئے

راجندر سنگھ بیدی اس افسانے میں یہ بتا رہے ہیں کہ ایک عورت کو اپنے شوہر کے لئے کتنا احترام ہوتا ہے۔ یہ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمی جب اپنے خاوند کا پھٹا ہوا کوٹ دیکھتی ہے تو وہ ترستی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچتی ہیں کہ تنخواہ پر گزارہ ہی نہیں۔ آخر کار بیوی اپنے خاوند کیلئے کوٹ لاتی ہے اور اپنے خاوند کو پیار سے پیش کرتی ہے۔

میرے خیال میں مصنف نے اس افسانے میں یہ بیان کیا ہے کہ ایک عورت اپنے خاوند کے لئے کس طرح سے گھر کا ماحول اور اپنے خاوند کو ٹھیک رکھتی ہے۔ معاشی حالت بری ہے لیکن پھر بھی بچوں کو قائدے سے رکھتی ہے اور اچھے طریقے سے دن گزارتی ہے۔

بچوں کے ساتھ غلط بات

راجندر سنگھ بیدی اس افسانے میں بتا رہے ہیں کہ گھر کی معاشی حالت بری ہے جس کی وجہ سے بچوں کی مانگ پوری نہیں کر سکتے۔ جیسے کہ بچے اپنے ماں باپ سے یہ گذارش کرتے ہیں کہ انہیں رسگولے کھلائے جائیں اور تفریح کے لئے ٹرائے سائیکل مہیا کی جائے۔ لیکن انہیں کئی بار جھوٹ کہہ کر یقین دلایا جاتا ہے کہ انکی مانگ ضرور پوری ہوگی۔ اگر چہ یہ وعدہ پورا نہیں کر سکتے تو بچے جھوٹ بولنا سیکھتے ہیں۔

مصنف نے نصیحت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے قسم کی یقین دہانی بچوں کو نہیں دینی چاہیئے۔ انہیں صاف کہنا چاہیئے کہ گھر کی معاشی حالت بری ہے اور غربت

ہونے کے وجہ سے مانگ پوری نہیں کر سکتے۔ جب اچھی تعلیم حاصل کرو گے تو خود بخود ان چیزوں کی دستیابی گھر میں ہوگی۔ اس قسم کی نصیحتیں بچوں کو دینی چاہئیں۔

خیر میں افسانے کو نصیحت آمیز افسانہ قرار دے سکتا ہوں۔ مصنف نے "گرم کوٹ" کا عنوان صحیح ٹھہرایا ہے کیونکہ ایک کوٹ کو ترجیح دے کر مصنف نے کتنا بہترین افسانہ لکھا ہے۔ لیکن اگر چہ ہم غور سے سوچیں تو مصنف نے اس افسانے کا عنوان "گرم کوٹ" صحیح لکھا ہے۔ لیکن جب مجھے افسانہ نگار، تنقید نگار اور محقق اس کے بارے میں رائے دینے کے لئے کہیں تو میں اپنی رائے یہ دوں گا کہ مصنف نے گرم کوٹ کو ہزار بار اس افسانے میں دہرایا ہے جو کہ غیر مناسب لگتا ہے۔ تو "گرم کوٹ" سے بہتر یہ ہونا چاہئے "رہا حالِ غربت میں"۔

رہا حال غربت میں
راجندر سنگھ بیدی اور ٹھاکر پونچھی

میں نے دو مصنفوں کی کہانی اور افسانہ تنقید کے ساتھ اس کتاب میں لکھا۔ لیکن اب پڑھنے والے یہ کہیں گے کہ "رہا حال غربت میں" کے دو مصنف کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ یعنی جناب راجندر سنگھ بیدی اور جناب ٹھاکر پونچھی۔ اب پڑھنے والے یہ سوال ضرور اٹھائیں گے کہ افسانہ اور کہانی مشترکہ طور پر تسلیم نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس کی وضاحت میں اس طرح کرتا ہوں۔

نفاق کہانی اور افسانے میں

میں مانتا ہوں کہ کہانی ایک لہجے میں اور افسانہ دوسرے لہجے میں تحریر کیا جاتا ہے لیکن خیالات دونوں مصنفوں کے ایک جیسے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ٹھاکر پونچھی صاحب اپنی کہانی میں جھونپڑی کی دلیل دے کر ہمیں غربت کے ماحول سے واقف کراتے ہیں۔ اسی طرح سے راجندر سنگھ بیدی "گرم کوٹ" کے نام پر ہمیں غربت کے آثار کی وجوہات کا پتہ دیتے ہیں۔ مانتے ہیں کہ "گرم کوٹ" اور "جھونپڑی" میں زمین

وآسمان کا فرق ہے لیکن دونوں مصنفوں نے جس لہجے سے بیان بازی اپنی تخلیقوں میں کی ہے۔ اس سے ہمیں سمجھنا چاہئے اور تسلیم کرنا چاہئے کہ ایک ہی خیال کے دو مصنف ہیں۔

مختلف کردار مختلف کارنامے

میں مانتا ہوں راجندر سنگھ بیدی نے اپنی کہانی ''گرم کوٹ'' میں شمی کو خاص کردار بنایا ہے۔ اسی طرح سے ٹھاکر پونچھی نے اپنی کہانی ''فاصلہ'' میں کلپنا کو خاص کردار لکھا ہے۔ اگر دونوں کے کرداروں کے بارے میں سوچیں اور تحقیق کریں تو مجھے پورا یقین ہے کہ تمام پڑھنے والے میری رائے سے اتفاق کریں گے کہ شمی غربت کی ماری کس طرح گھر کو سنبھالتی ہیں۔ اسی طرح سے کلپنا اکیلے رہ کر اپنی عصمت کو بچانے کے لئے اور دیگر مسائل سے بچنے کیلئے سوچتی رہتی ہے اور یہ بھی سوچتی ہے کہ وہ کس طرح آئندہ کے لئے اپنی زندگی بسر کرے گی۔ یعنی غربت کے بارے میں سوچتے سوچتے گاڑی کے تلے آجاتی ہے اور دم توڑ بیٹھتی ہے۔

اسی لئے میری یہی رائے ہے کہ دونوں کرداروں کے واقعات بیان کر کے مصنفوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غربت میں جینے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ میری رائے میں دونوں مصنفوں کی کہانیوں میں ایک ہی خیال کارفرما ہے۔

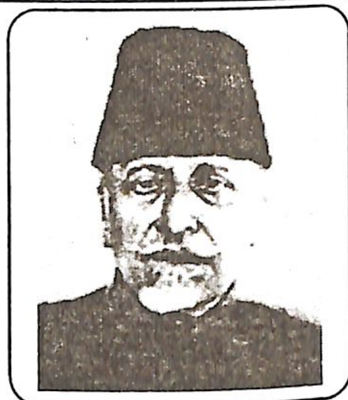
ماحولیات، کہانی اور افسانے میں

میرے خیال میں مصنفوں نے کہانی اور افسانے میں غربت کے ماحول کو ایک جیسا ماحول بیان کیا ہے۔ جھونپڑی میں لوگ کیسے اپنی روزمرہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جیسے کہ ایک نئی شادی شدہ کے لئے بزرگ کمرے میں سوتا ہے اور شادی شدہ کو باہر صحن میں سونے کی اجازت فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح سے راجندر سنگھ بیدی نے

اپنے افسانے ''گرم کوٹ'' میں اس قسم کا تذکرہ بیان کیا ہے کہ جب شمی کا خاوند کلب میں اپنی حاضری دے رہا ہے تو وہاں پر جوا کھیلنے والوں میں جو جیتتے ہیں وہی شمی کے خاوند کو کچھ پیسہ دیتے ہیں۔ اس کا مطلب غربت کے ماحول میں بسنے والے کو احساس کے طور پر امداد دی جارہی ہے۔ اسی طرح سے دوسرے قسم کے لوگ بھی غریبوں پر ترس کھاتے ہیں۔ پڑھنے والے تسلیم کریں گے کہ راجندر سنگھ بیدی اور ٹھاکر پونچھی کے خیالات ایک جیسے ہیں۔

اب ہمیں ماننا چاہیئے کہ ٹھاکر پونچھی اور راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ اور کہانی ایک ہی عنوان سے میل کھاتے ہیں۔ اسی لئے میں یہی عنوان تجویز کرونگا ''رہا حالِ غربت میں''۔

اب پڑھنے والوں تنقید نگاروں اور محققین کی کیا رائے ہے۔ کیا وہ میرے تجویز سے متفق ہیں یا نہیں۔



مولانا ابوالکلام آزاد

بھارت چھوڑو تحریک

میں نے ساہتیہ اکیڈمی کی چھپی ہوئی کتاب ''غبارِ خاطر'' پڑھی۔ پڑھ کر اس بات کا احساس ہوا کہ مالک رام نے مولانا آزاد کے خطوط تحریر کر کے اس کتاب میں یہ کہا ہے کہ یہ خطوط ہم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے قلمی نسخے سے ترتیب کر کے چھاپے۔ ساہتیہ اکیڈمی نے ان خطوط کو چھاپا لیکن ان کا مفہوم پڑھنے والے کو صحیح انداز سے سمجھ میں نہیں آیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب ایک بڑے قدآور ادبی شخصیت اور سیاسی شخصیت تھے لیکن ان کے خطوط تاابد ہندوستانی تحریک کے لئے سنگِ میل کی حیثیت سے موجود رہیں گے۔ اِن خطوط سے ہر ایک ہندوستانی کو معلوم ہوگا کہ کس طرح مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستانی تحریک میں انگریزی

سامراج کے خلاف دن رات کام کیا اور مختلف تقریریں ہندوستان کی ریاستوں میں دے کر لوگوں کو آزادی کے لئے بیدار کیا۔

لیکن ساہتہ اکیڈمی نے ''غبارِ خاطر'' میں ایک خط چھاپ کر پڑھنے والوں کو اشارہ کیا ہے کہ انگریزی سامراج کے دوران خط و کتابت کی انگریزی حکومت جانچ پڑتال کرتی تھی۔ یعنی جب سیاستدان کوئی خط کسی کے نام ارسال کرتا تھا تو اس سے پہلے انگریزی حکومت اسے خفیہ طور پر پڑھتی تھی اور صیغۂ راز سے واقف ہوتی تھی۔ ممکن ہے کہ اسی لئے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خطوط دوستوں کے نام اس طریقے سے لکھے جس کو پڑھنے والا ہی سمجھ سکتا ہے اور انگریزی سامراج کی سراغ رسانی بالکل ناکامیاب رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خط قلعہ احمد نگر (۱۱/اپریل ۱۹۴۳ء) میں ساہتہ اکیڈمی نے ترتیب دیا اور چھاپا۔ جب پڑھنے والے۔ میں بھی اپنی سوچ سے دو تین خطوط کی وضاحت بیان کرتا ہوں جیسے کہ

شملہ

۲۷/جون ۱۹۴۵ء

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می بینمت عیان و دعامی فرستمت!

دل حکایتوں سے لبریز ہے، مگر زبانِ درماندۂ فرصت کو یارائے سخن نہیں مہلت کا منتظر ہوں۔

ابوالکلام

میری رائے میں جناب مولانا ابوالکلام آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ وہ پوشیدہ راز لوگوں تک نہیں پہنچا سکتا ہے۔ انگریزی سامراج نے ہمیں بہت ساری تکالیف دی ہیں۔ ان تکلیفوں کو تہس نہس کرنے کیلئے میں یہی دعا مانگتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس

ملک سے دفع کرے۔ یہ رائے میں اس لئے لکھتا ہوں کیونکہ مولانا ابوالکلام آزاد خود اوپر کے دو مصرعے سے بتاتے ہیں کہ اے خدا یہ انگریز کب ہماری آنکھوں سے دور ہوں گے۔ جب آنکھوں سے دُور ہو جائیں گے تو دِل سے بھی دُور ہو جائیں گے۔ لیکن ان کی دُوری سے میں انسانیت کے خلاف نہیں ہوں میں انسانیت کا احترام کرتا ہوں اگر ہمارا ملک انگریزی سامراج سے الگ تھلگ ہو جائے گا تو ہمارے نظام میں انگریزوں کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو ہم اپنے ملک کے لوگوں کے ساتھ کریں گے۔ لیکن ان کی موجودہ حکومت ہندوستانیوں کے لئے بہت ہی بری ہے۔ مطلب ان کے کرتوتوں سے ہر ایک ہندوستانی تنگ آچکا ہے۔ جب ہم آزادی حاصل کریں گے تو ''ہم سخن'' فراخ دلی سے ہندوستانی برادری آپس میں بات کریں گے۔ اسی لئے میں نے اس خط کو بھارت چھوڑ و تحریک کے ساتھ اور عنوان کے ساتھ جوڑا۔

عیش و عشرت کے سامان نہیں
بلکہ ہندوستان کی آزادی

مکتوب بہ سرینگر
ہاؤس بوٹ۔ سرینگر
۱۴ر اگست ۱۹۴۵ء

گہے از دست، گاہے از دل و گاہے زپا مانم
بسرعت می روی اے عمر! می ترسم کہ وا مانم

صدیق مکرم

زندگی کے بازار میں جنس مقاصد کی بہت سی جستجو میں کی تھیں۔ لیکن اب ایک نئی متاع کی جستجو میں مبتلا ہو گیا ہوں، یعنی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی ڈھونڈ ھ رہا ہوں۔ معالجوں نے وادی کشمیر کی گل گشتوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا۔ چنانچہ گذشتہ ماہ کے اواخر میں گلمرگ پہنچا اور تین ہفتہ تک مقیم رہا۔ خیال رہا تھا کہ یہاں کوئی سراغ پاسکوں گا مگر ہر چند جستجو کی، متاع گم گشتہ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہاں فیضی نے کبھی بارِ عیش کھولا تھا۔

ہزار قافلۂ شوق می کشد شبگیر
کہ بارِ عیش کشاید بخطۂ کشمیر

لیکن میرے حصے میں ناخوشی وعلالت کا بار آیا۔ یہ بوجھ جس طرح کاندھوں پر اٹھائے آیا تھا۔ اسی طرح اٹھائے واپس جا رہا ہوں۔ خود زندگی بھی سرتاپا ایک بوجھ ہی ہے خوشی سے اٹھائیں یا ناخوشی سے، مگر جب تک بوجھ سر پر پڑا ہے۔ اٹھانا ہی پڑتا ہے۔

ما زندہ از انیم کہ آرام نگیریم

گلمرگ سے سرینگر آ گیا ہوں اور ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ کل گلمرگ سے روانہ ہو رہا تھا کہ ڈاک آئی اور اجمل خاں صاحب نے آپ کا مکتوبِ منظوم حوالہ کیا کہہ نہیں سکتا کہ اس پیامِ محبت کو دلِ دردمند نے کن آنکھوں سے پڑھا اور کن کانوں سے سنا۔ میرا اور آپ کا معاملہ تو وہ ہو گیا ہے۔ جو غالب نے کہا تھا۔

باچوں توئی معاملہ، برخویش منت ست
از شکوۂ تو شکر گزارِ خودیم ما

آپ نے اپنے تین شعروں کا پیام دلنواز نہیں بھیجا ہے، لطف وعنایت کا ایک پورا دفتر کھول دیا ہے۔

قلیل منک یکفینی ولکن
قلیلک لایقال لہ قلیل

ان سطور کو آئندہ خامہ فرسائیوں کی تمہید تصور کیجئے۔ ربانی کے بعد جو کہانی سنائی تھی وہ ابھی تک نوکِ قلم سے آشنا نہ ہو سکی۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام

میں نے پہلے پہل ہی اس بات کی توجہ مرکوز کی کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خطوط دوسرے انداز میں لکھ کر اپنے دوستوں کو آزادی کے جدوجہد کے بارے میں خطوط ارسال کئے ہیں۔ اس بات کا پورا احساس پڑھنے والے کو ہو جائے گا جب اس خطوط کو اچھے ڈھنگ سے پڑھینگے۔

میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ کبھی میں بمبئی میں، کبھی کلکتہ میں، کبھی پنجاب میں، کبھی بہار میں مطلب ہندوستان کے کونے کونے میں لوگوں کو آزادی کے بارے میں کہہ رہا ہوں کہ آزادی حاصل کرنے سے ہر ایک آدمی کو کون کون سے فائدے فراہم ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کو انگریزی سامراج کے خلاف بھی بولتا ہوں۔ یہ بھی بولتا ہوں کہ انگریزی سامراجیت سے ہم ہندوستانیوں کو کیس قسم کی تکلیف اٹھانی پڑے۔

اب میں سرینگر پہنچا ہوں۔ بہت ہی دلچسپ مقام ہے یہاں میں ایک ہاؤس بوٹ میں ٹھہرا ہوں۔ لیکن جب میں کشمیر کے سرسبز باغات، جھیلیں دیکھتا ہوں مجھے بہت ہی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن غم اس بات کا دل میں رہا ہے کہ کب ہم ملک کو آزاد کریں گے اور جب ملک کو آزاد کریں گے تو اسی وقت یہ سرسبز باغات، جھیلیں، چشمے کشمیر کے میرے دل میں جگہ پا سکتے ہیں۔

اگرچہ میں سرینگر میں بیٹھا ہوں لیکن میرا دِل دلی میں آزادی کے چکر میں گھوم رہا ہے۔ یعنی ہر ایک ریاست کے باشندے کے ساتھ آزادی کی تحریک کے بارے میں میرا دل گھوم رہا ہے۔ میں پرسکون انداز میں اور ماحول میں اس ہاؤس بوٹ میں نہیں ٹھہرا اگرچہ میں گلمرگ سے آگیا ہوں اور ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں لیکن میرا دل تحریک کے ساتھ جوڑا ہوا ہے۔ فراخدلی کشمیر کو دیکھنے کے لئے نہیں ہے۔ جب دل ہی مطمئن نہیں ہے تو سرینگر کے ہاؤس بوٹ میں ٹھہرنے کا مطلب ہی کیا ہے۔ جب

سکونِ دل ہی نہیں ہے۔

میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب آزادی کی جدوجہد کے چکر میں رہ کر خطوط ارسال کرنے والے کو اس بات کا بھی احساس دلاتے ہیں کہ اتنی پریشانی کے باوجود ان تین شعروں کا مطلب ہی نہیں بھیجا۔ لیکن آپ کو میری طرح ہندوستان کے آزادی کے لئے بہت ہی پریشانی ہوگی۔ پھر بھی شعروشاعری سے تعلق رکھا۔ اسی لئے آپ کے پاس لطف وعنایت کا ایک پورا دفتر موجود ہے۔ اس کے برعکس مولانا ابو الکلام آزاد صاحب کہہ رہے ہیں کہ ان کے پاس لطف وعنایت کا دفتر ہی مہیا نہیں ہے۔ ان کے پاس آزادی کا ایک دفتر چوبیس گھنٹے کام کررہا ہے۔

میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب آخر میں یہ کہہ رہے ہیں کہ شعروں کی خامی پُراسرار طریقے سے بیان کیجئے۔ کیونکہ میرے پاس آزادی کا بیان ہے اور وہی بیان تمام ریاستوں میں لوگوں کو اس کی بیداری سے روشناس کرتا ہے۔ اسی لئے ان سطور کو آپ ہی خود ٹھیک کیجئے۔ رہائی کے بعد میں نے جو کہانی سنائی وہ ابھی تک قلم بند نہیں کی۔ میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ جب ہندوستان انگریزی سامراج سے آزاد ہوجائے گا تو وہ دردبھری کہانی جو مختلف جیلوں میں سنی ہے، اس کو بھی آزادی کے بعد قلم بند کر کے عوام تک پہنچاؤں گا۔

میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب صحیح فرماتے ہیں کہ اگرچہ وہ کشمیر آئے اور قیام بھی کیا لیکن عیش وعشرت سے مبرا رہا۔

مطلب کشمیر کے نظاروں سے واقفیت ہی نہیں۔ ان کی واقفیت جنگ آزادی کے ساتھ تھی جو دن رات دماغ میں گھونجتی رہی۔ جب وطن آزاد ہوگا تو اسی وقت غیرت عسرت کے ساتھ میسر ہوگی اور پراسرار طریقے سے دل کو بہلانے کے انداز میں وادی کا دورہ کرنا لازمی ہوگا۔

وطن کی فریاد ہے، تصویر میں ہے جنت

مکتوبِ نسیم باغ

نسیم باغ، سرینگر
۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء

(۱) از ماپرس دردِ دل ما، کہ یک زبان
خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

صدیق مکرم
وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ دہنی طرف جھیل کی وسعت شالیمار اور نشاط باغ تک پھیلی ہوئی ہے۔ بائیں طرف نسیم باغ کے چناروں کی قطاریں دُور تک چلی گئی ہیں۔ چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔

(۲) گرچہ دُوریم ، بیادِ تو قدح می نوشیم

بعدِ منزل نہ بود در سفر روحانی!

گرفتاری سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام لکھ سکا تھا، وہ ۳ر اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا۔ کلکتہ سے بمبئی جارہا تھا۔ ریل میں خط لکھ کر رکھ لیا کہ بمبئی پہنچ کر اجمل خان صاحب کے حوالے کروں گا۔ وہ نقل رکھ کر آپ کو بھیج دیں گے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے خطوط کی نقول رکھنے پر اصرار کیا تھا اور میں نے یہ طریقہ منظور کرلیا تھا۔ لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں کے ہجوم میں اس طرح کھو گیا کہ اجمل خان صاحب کو خط دینا بھول گیا۔ ۹ر اگست کی صبح کو جب مجھے گرفتار کر کے احمد نگر لے جارہے تھے تو بعض کاغذات رکھنے کے لئے راہ میں اٹیچی کیس کھولا، اور یکایک وہ خط سامنے آگیا۔ اب دنیا سے تمام علاقے منقطع ہو چکے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ کوئی خط ڈاک میں ڈالا جاسکے۔ میں نے اسے اٹاچی کیس سے نکال کر مسودات کی فائل میں رکھ دیا اور فائل کو صندوق میں بند کر دیا۔

دو بجے ہم احمد نگر پہنچے اور پندرہ منٹ کے بعد قلعہ کے اندر محبوس تھے۔ اب اس دنیا میں جو قلعہ سے باہر تھی اور اس دنیا میں جو قلعہ کے اندر تھی، برسوں کی مسافت حائل ہوگئی۔

(۳) کیف الوصل الی سعاد ودونھا

قلل الجبال وبینھن حتوف

دوسرے دن یعنی ۱۰ر اگست کو حسب معمول صبح تین بجے اٹھا۔ چائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہتا ہے وہاں بھی سامان کے ساتھ آگیا تھا۔ میں نے چائے دم دی فنجان سامنے رکھا، اور اپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ خیالات مختلف میدانوں میں بھٹکنے لگے تھے اچانک وہ خط جو ۳ر اگست کو ریل میں لکھا تھا اور کاغذات میں پڑا تھا یاد آگیا۔ بے اختیار جی چاہا کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں۔ اور آپ سن رہے ہوں یا نہ سن

رہے ہوں، مگر روئے سخن آپ ہی کی طرف رہے۔ چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلم بند ہو گیا اور اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مکتوب قلم بند ہوتے رہے۔ آگے چل کر بعض دیگر احباب واعزہ کی یاد بھی سامنے آئی اور ان کی مخاطبت میں بھی گاہ گاہ طبع ورماندۂ حال درازنفسی کرتی رہی۔ قید خانہ سے باہر کی دنیا سے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے اور مستقبل پردہ غیب میں ستور تھا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوب کبھی مکتوب الیہ تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ تاہم ذوق مخاطبت کی طالب گاریاں کچھ اس طرح دل مستمند پر چھا گئی تھیں کہ قلم اٹھالیتا تھا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا، کبھی بال کبوتر سے، میرے حصے میں عنقا آیا۔

(۴) ایں رسم وراہ تازہ زحرمانِ عہد ماست
عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود

۱۰/ اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک ان مکتوب کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا، لیکن اس کے بعد رُک گیا۔ کیونکہ ۹/ اپریل ۱۹۴۳ء کے حادثہ کے بعد طبع درماندۂ حال بھی رک گئی تھی، اور اپنی درماندگیوں میں گم تھی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی بعض مصنفات کی تسوید وترتیب کا کام بدستور جاری رہا۔ اور قلعہ احمد نگر کی اور تمام معمولات بھی بغیر کسی تغیر کے جاری رہیں۔ تاہم یہ حقیقت حال چھپانا نہیں چاہتا کہ قرار وسکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی جس وصورت کی تھی، قلب وباطن کی نہ تھی، جسم کو میں نے ہلنے سے بچالیا تھا مگر دل کو نہیں بچا سکا تھا۔

(۵) دلِ دیوانہ دارم کہ در صحراست پنداری

اس کے بعد بھی گاہ گاہ حالات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتہ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں۔ مگر اس سلسلہ کتابت کی وہ تیز رفتاری مفقود ہو چکی تھی، جس نے اوائل حال میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوارا میں قد تبدیل

کردی گئی، تو طبیعت کی آمادگیوں نے آخری جواب دے دیا۔ صرف بعض مصنفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جاسکا، اور کسی تحریر تسوید کے لئے طبیعت مستعد نہ ہوئی۔ آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل کی نسبت ایک عزیز کے نام قلم بند ہوا ہے۔ ۳/ مارچ ۱۹۴۵ء کا ہے۔ اس مکتوب پر یہ داستان بے ستون وکوہکن ختم ہو جاتی ہے اگر چہ زندگی کی داستان ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔

(۶) شمۂ از داستانِ عشق شورانگیز ماست
این حکایتہا کہ از فرہاد وشیریں کردہ اند

غور کیجئے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہے تین برس کی مدت ہو یا تین دن کی، مگر جب گذرنے پر آتی ہے تو گذر ہی جاتی ہے گذرنے سے پہلے سوچئے، تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیونکر کٹے گی! گذرنے کے بعد سوچئے تو تعجب ہوتا ہے کہ کچھ گذر چکا وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا۔

رہائی کے بعد جب کانگریس ورکنگ کمیٹی کی صدارت کے لئے ۲۱ جون کو کلکتہ سے بمبئی آیا اور اسی مکان اور اسی کمرہ میں ٹھہرا، جہاں تین برس پہلے اگست ۱۹۴۲ء میں ٹھہرا تھا تو یقین کیجئے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے ۹/ اگست اور اس کے بعد کا سارا ماجرا کل کی بات ہے اور یہ پورا زمانہ ایک صبح شام سے زیادہ نہ تھا۔ حیران تھا کہ جو کچھ گذر چکا وہ خواب تھا یا جو کچھ گذر رہا ہے یہ خواب ہے۔

(۷) ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

جون کو جب بانکواڑ میں رہا ہوا، تو تمام مکتوبات نکالے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کردیئے۔ خیال تھا کہ انہیں حسب معمول نقل کرنے کے لئے دے دوں گا۔ اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ لیکن جب مولوی اجمل خان صاحب کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مصر ہوئے کہ انہیں بلا تاخیر اشاعت کیلئے دے دینا

چاہیئے۔ چنانچہ ایک خوش نویس کو شملہ میں بلایا گیا اور پورا مجموعہ کتابت کے لئے دے دیا گیا۔ اب کتابت ہو رہی ہے اور امید ہے کہ عنقریب طباعت کے لئے پریس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اب میں یہ مکتوبات کو قلمی مکتوبات کی صورت میں نہیں بھیجوں گا، مطبوعہ مجموعے کی صورت میں پیش کروں گا۔

شملہ میں اخبار مدینہ بجنور کے ایڈیٹر صاحب آئے تھے۔ انہوں نے مولوی اجمل خاں صاحب سے اس سلسلہ کے پہلے مکتوب کی نقل لے لی تھی۔ وہ اخبارات میں شائع ہو گیا ہے، شاید آپ کی نظر سے گذرا ہو۔ ''صدیق مکرم'' کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کے روئے سخن آپ ہی کی طرف تھا۔

(۸) چشم سوے فلک وروے سخن سوئے تو بود

مکتوبات کے دو حصے کر دیئے ہیں۔ غیر سیاسی اور سیاسی یہ مجموعہ صرف غیر سیاسی مکاتیب پر مشتمل ہے۔ اس کے تمام مکاتیب بلا تردد آپ کے نام لکھے گئے ہیں۔

پرسوں دہلی کا قصد ہے چونکہ امریکن فوج کے جنرل مقیم دہلی نے از راہ عنایت اپنا خاص ہوائی جہاز یہاں بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے۔ اس لئے موٹر کار کے تکلیف دہ سفر سے بچ جاؤں گا اور ڈھائی گھنٹے میں دہلی پہنچ جاؤں گا۔ وہاں عید کی نماز پڑھ کر بمبئی کے لئے روانہ ہونا ہے۔ ۱۰ سے ۲۴ تک بمبئی میں قیام رہے گا۔

ابوالکلام

(۱) میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ ''وطن کی فریاد ہے، تصویر میں ہے جنت'' مطلب مولانا ابوالکلام آزاد صاحب فرما رہے ہیں کہ وہ چار بجے سرینگر پہنچے اور نسیم باغ سے اس خط کو لکھ رہا ہوں ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں۔ ایک طرف جھیل کا نظارہ، شالیمار باغ اور نشاط باغ بائیں طرف نسیم باغ کے چناروں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہے۔ اس وقت میں چائے پی رہا ہوں آپ کی یاد

تازہ کرر ہا ہوں۔ اگر چہ میں سرینگر میں بیٹھا ہوں میری سامنے تصویر ہے دلّی کی، دل کا سکون ہی نہیں۔ میرا دل وطن کی فریاد کے ساتھ ہے وہ یہ آزادی کا پرچم لہرانے کے بعد یہ تصویر دیکھنے کے لئے آؤں گا اور اس تصویر کو جنت کی شکل میں دل میں قائم رکھوں گا۔

(۲) میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ جب میرے دل میں سکون ہی نہیں لیکن جنت کی تصویر سامنے ہے میں اس سے ہاتھ بھی نہیں لگاتا ہوں اور آنکھوں سے روشناس نہیں ہوتا ہوں کیونکہ گرفتاری سے پہلے میں نے آخری خط جو آپ کے نام ارسال کیا تھا۔ ۳/اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا۔ کلکتہ سے بمبئی جار ہا تھا یہ خط ریل میں تشکیل دیا۔ میرے خیال میں یہاں پر بھی مولانا ابوالکلام آزاد صاحب ٹھیک طرح سے لکھ رہے ہیں کہ انگریزی سامراج میں محکمہ سراغ رسانی خط وکتابت کا پردہ فاش کرتی ہے۔ مطلب وہ خطوط کو پڑھتے ہیں اور پھر ارسال کرتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب خود کہتے ہیں کہ لکھنے کا طریقے ترک ہی کیا۔ انگریزی حکومت ہونے کی وجہ سے خط میں صاف وضاحت نہیں کی ہے۔ وہ یوں مولانا صاحب کو جب ۹/اگست کی صبح کو انگریزی حکومت گرفتار کرتی ہے اور کاغذات رکھنے کے لئے راستے میں اٹیچی کیس کھولا اور یکا یک وہ خط سامنے آ گیا۔ لیکن خط سامنے آتے ہی گرفتاری کی وجہ سے تمام علاقے منقطع ہو چکے تھے۔ اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب خود کہتے ہیں خط وکتابت میں وضاحت بیان نہیں کرنی کیونکہ جب انگریزی سامراج اچانک انہیں گرفتار کرے گی تو اس وقت کاغذات کی جانچ ہو کر میرے دوستوں کو تعزیتیں پہنچیں گی۔ اسی لئے میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد نے وضاحتی طور پر خط ارسال نہیں کئے۔ کیونکہ خود مولانا ابوالکلام آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ کوئی خط ڈاک میں ڈالا جا سکے لیکن یہ تمام خطوط فائل میں رکھ کر صندوق میں بند کر دئے۔ یہ

خطوط مولانا ابوالکلام آزاد صاحب نسیم باغ میں لکھتے ہیں اوران کوتشکیل دیتے ہیں۔ اسی لئے میں نے وضاحت کے ساتھ یہ کہا کہ وطن کی فریاد ہے تصویر میں ہے جنت۔ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اگر کشمیر میں بیٹھے ہونگے لیکن ان کا دل آزادی کی جدو جہد کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

(۳) جب مولانا ابوالکلام آزاد صاحب خط کو لکھ رہے اور پرانے دلائل اس خط میں تشکیل دے رہے ہیں جیسے کہ دوسرے دن یعنی ۱۰/اگست کو حسب معمول صبح ۳ بجے اٹھے۔ چائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہتا ہے۔ وہاں بھی سامان کے ساتھ آ گیا۔ یعنی مولانا ابوالکلام آزاد کشمیر کے حسن کے بارے میں کوئی ذکر ہی خط میں نہیں کرتے ہیں۔ وہ گذری ہوئی اور انگریزی سامراج کی تعزیتیں دہرا دہرا کر خط میں تشکیل کرتے ہیں۔ اسی لئے میں نے عنوان ''وطن کی فریاد ہے، تصویر میں ہے جنت'' رکھی ہے۔

(۴) مولانا ابوالکلام آزاد صاحب ۱۰/اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک اپنے گذرے ہوئے واقعات اس خط میں بیان کرتے ہیں۔ اگرچہ آغاز میں مولانا ابو الکلام آزاد صاحب خط میں کہتے ہیں کہ مکتوبِ نسیم باغ میں اس کا ذکر ہی نہیں اور کشمیر کے ہوا کے بارے میں بھی ذکر نہیں اور ڈل جھیل کے بارے میں بھی ذکر نہیں۔ ذکر کرتے ہیں تو آزادی کی جنگ کے بارے میں اور اسی لئے تصویر دل میں لیکن فریاد وطن کے ساتھ۔ اس تصویر کو سامنے رکھا۔

(۵) مولانا صاحب فرماتے ہیں نسیم باغ میں جب وہ گاہ بگاہ تحریک کا کام کرنے لگے تو رشتہ داروں سے بھی رشتہ منقطع ہو گیا۔ کشمیر میں بیٹھ کے مجھے صحت یاب ہونا ہے۔ لیکن آزادی کی تحریک کے وجہ سے طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کبھی کسی جیل میں کبھی کسی دلیل میں۔ اتنی فکر ہونے کے باوجود اس نسیم باغ میں طبیعت کو ٹھیک کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ چٹھی میں یہ واقعات نہیں بیان کرتا لیکن میرے خیال میں یہ

واقعات اسی لئے اس سطور کے ساتھ میں نے خود جوڑے۔ جس نے اوائل حال میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا'۔ اسی طرح سے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اپنے ہی واقعات نسیم باغ میں چٹھی لکھتے ہیں۔ تبھی تو صحیح ہے 'وطن کی فریاد ہے، تصویر میں ہے جنت''۔

(٦) میرے خیال میں اب مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اس چٹھی میں نسیم باغ میں آگے خیالات لکھ رہے ہیں۔ جب بھی کوئی انسان انسانیت کی جنگ کے لئے لڑتا ہے اس کو کئی اصولوں کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ اگرچہ میں نے آزادی کے لئے اپنی زندگی مصروف رکھی وہ یہ نہیں کہ اس کا ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔ کیونکہ جب میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے صدارت کے لئے ۲۱/جون کو کلکتہ سے بمبئی آیا اسی کمرے میں ٹھہرا جہاں ۳ برس پہلے اگست ۱۹۴۲ء میں ٹھہرا تھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ ۹/ اگست اور اس کے بعد کا سارا ماجرا کل کی بات ہے اور حیران تھا کہ جو کچھ گذر چکا وہ خواب تھا۔ یا جو کچھ گذر رہا ہے یہ خواب ہے۔

میرے خیال میں اگرچہ اس قلم کو جوڑیں گے تو یقیناً مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی یہ چٹھی نسیم باغ میں لکھی تو خود بخود تسلیم کرتے ہیں کہ جہاں میں بیٹھا ہوں وہ کشمیر ہے۔ اور جہاں میرا دل ہے وہ ہند کی آزادی کے جدوجہد کے لئے ہے۔ اسی لئے ''وطن کی فریاد ہے، تصویر میں ہے جنت''۔ جیسے کہ حیران تھا کہ جو کچھ گذر چکا وہ خواب تھا یا جو کچھ گذر رہا ہے یہ خواب ہے۔ یعنی میں کشمیر میں بیٹھا ہوں یہ بھی ایک خواب ہے کیونکہ سکون سے نہیں بیٹھا ہوں، میرا دل وطن کے آزادی کے لئے ہے۔ وہ بھی خواب ہے۔ اس کو ان دو خوابوں کو پورا کرنا ہی ہے۔

(٧) مولانا ابوالکلام آزاد صاحب وضاحت کرتے ہیں کہ وہ ہند کی آزادی کی جدوجہد کے لئے متحرک ہیں کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ آزادی ملے یا نہ ملے لیکن خواب ہے۔ خواب کیسا ہے کئی انگریز کہہ رہے ہیں ہم ملک نہیں چھوڑیں گے۔ ہم کہہ رہے

ہیں کہ انگریزوں کو بھاگنا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کونسا خواب عوام کے لئے پورا کرے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہند کی آزاد کے حق میں خواب پورا کرے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب انگریزی حکومت کے دوران اخباروں کی آزادی کے بارے میں بھی اس چٹھی میں واقعات بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ آزادی پوری طرح سے اخباروں کے لئے مہیا نہیں ہے لیکن ادبی مواد کے چھاپنے پر انگریزی حکومت کے دوران کوئی پابندی نہیں تھی کیونکہ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب خود تسلیم کرتے ہیں کہ مولوی اجمل خاں صاحب نے مکتوب کی نقل لے لی تھی شاید وہ اخبارات میں شائع ہوگئی ہے۔ اس بات کا ذکر لکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ادبی لحاظ سے اخباروں میں کوئی پابندی نہیں۔

(۸) میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب چٹھی کے آخر میں اپنی قلم سے یہ تحریر کرتے ہیں کہ میں یہ چٹھی لکھتے لکھتے میں نسیم باغ کی تصویر دیکھتا ہوں اور گذرا ہوا حال بیان کرتا ہوں۔ جب یہ چٹھی ارسال کرتا ہوں تو مجھے عید کا دن یاد آیا کیونکہ عید آنے والی ہے۔ میں وقت پر عید کی نماز دلّی میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ خدا کی مدد سے کوئی جہاز مل ہی جائے گا اور اس کے ذریعہ وقت پر ہی پہنچوں گا۔

میرے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ کشمیر میں چٹھی لکھتے وقت حاضر ہوں لیکن میرا دل دلّی کے لوگوں کے ساتھ ہے۔ میں اپنی عید انہی کے ساتھ منانا چاہتا ہوں۔ مانتا ہوں کشمیر جنت ہے لیکن وطن کی فریاد ہونے کی وجہ سے مجھے آزادی کا پرچم لہرانا ہے اور اِسی فکر میں چوبیس گھنٹے میرا دل تڑپتا ہے۔ تبھی تو میں نے خط کو لکھتے وقت کشمیر کے نظاروں کے بارے میں کچھ بھی بیان نہیں کیا۔

اب یہ پڑھ کر خود اندازہ لگائیے کہ میں نے اس چٹھی کا عنوان "وطن کی فریاد ہے، تصویر میں ہے جنت" ٹھیک رکھا ہے یا نہیں۔ اب یہ فیصلا محقق حضرات کریں گے۔

داستانِ بے ستون و کوہ کن

قلعۂ احمد نگر

۱۰ر اگست ۱۹۴۲ء

(۱) از ساز و برگِ قافلۂ بے خوداں مپرس
لے نالہ می رود جرسِ کاروانِ ما!

صدیق مکرم

کل صبح تک وسعت آباد بمبئی میں فرصتِ تنگ حوصلہ کی بے مائگی کا یہ حال تھا کہ ۳ر اگست کا لکھا ہوا مکتوبِ سفر بھی اجمل خاں صاحب کے حوالہ نہ کرسکا کہ آپ کو بھیج دیں۔ لیکن آج قلعۂ احمد نگر کے حصارِ تنگ میں اُس کے حوصلۂ فراخ کی آسودگیاں دیکھ کر کہ جی چاہتا ہے، دفتر کے دفتر سیاہ کردوں۔

(۲) وسعتے پیدا کن اے صحرا کہ امشب در غمش
لشکرِ آہِ من از دل خیمہ بیروں می زند

نو مہینے ہوئے ۴ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو نینی کے مرکزی قید خانہ کا دروازہ میرے لئے کھولا گیا تھا۔ کل ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو سوا دو بجے قلعۂ احمد نگر کا حصار کہنہ کا نیا پھاٹک میرے

پیچھے بند کر دیا گیا۔ اس کارخانۂ ہزار شیوہ ورنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں، اور کتنے ہی بند کئے جاتے ہیں تاکہ کھلیں۔ نو ماہ کی مدت بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں معلوم ہوتی۔

(۳) دو کروٹیں ہیں عالم غفلت میں خواب کی

لیکن سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے تاریخ کی ایک پوری داستان گذر چکی:۔

(۴) چوں صفحہ تمام شد، ورق برگرد

نئی داستان جو شروع ہو رہی ہے، معلوم نہیں مستقبل اسے کب اور کس طرح ختم کرے گا:

(۵) فریب جہاں قصۂ روشن است
به بیں تاچہ زاید، شب آبستن ست

۴راگست کو بمبئی پہنچا، تو انفلوئنزا کی حرارت اور سر کی گرانی کا اضمحلال بھی میرے ساتھ تھا۔ تاہم پہنچتے ہی کاموں میں مشغول ہو جانا پڑا۔ طبیعت کتنی ہی بے کیف ہو لیکن گوارا نہیں کرتی کہ اوقات کے مقررہ نظام میں خلل پڑے۔ ۴ سے ۷راگست تک ورکنگ کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے۔ ۷ کی دوپہر سے آل انڈیا کمیٹی شروع ہوئی۔ معاملات کی رفتار ایسی تھی کہ کاروائی تین دن تک پھیل سکتی تھی اور مقامی کمیٹی نے تین ہی دن کا انتظام بھی کیا تھا، لیکن میں نے کوشش کی کہ دو دن سے زیادہ بڑھنے نہ پائے۔ ۸ کو دو بجے سے رات کے ۱۱ بجے تک بیٹھنا پڑا، لیکن کاروائی ختم کر کے اٹھا۔

(۶) کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

تھکا ماندہ قیام گاہ پر پہنچا تو صاحب مکان کو منتظر اور کسی قدر متفکر پایا۔ یہ صاحب

کچھ عرصہ سے بیمار ہیں اور ایک طرح کی دماغی الجھن میں مبتلا رہتے ہیں۔ میں اُن سے وقت کے معاملات کا تذکرہ بچا جاتا تھا، تاکہ ان کی دماغی الجھن اور زیادہ نہ بڑھ جائے وہ ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے کبھی مستعفی ہو چکے ہیں اور اگرچہ میں نے ابھی تک اُن کا استعفیٰ منظور بھی نہیں کیا ہے، لیکن انہیں کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کے لئے کہا بھی نہیں۔ وہ کہنے لگے فلاں شخص شام کو آیا تھا، کئی گھنٹے منتظر رہ کر ابھی ابھی گیا ہے اور یہ پیام دے گیا ہے کہ گرفتاری کی افواہیں غلط نہ تھیں۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تمام انتظامات کر لئے گئے ہیں۔ آج رات کسی وقت یہ معاملہ ضرور پیش آئے گا۔ دو ہفتے سے گرفتاری کی افواہیں دہلی سے کلکتہ تک ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ میں سنتے سنتے تھک گیا تھا۔

(۷) یاوفا، یا خبر وصل تو ، یا مرگ رقیب
بازی خرچ ازیں یک دوسہ کارے بکند

اور کچھ اس بات کا بھی خیال تھا کہ ان کی ماؤف طبیعت کو اس طرح کی فکروں سے پریشان نہ ہونے دوں۔ میں نے جھنجھلا کر کہا ”جس طرح کے حالات درپیش ہیں ان میں اس طرح کی افواہیں ہمیشہ اڑا ہی کرتی ہیں۔ ایسی خبروں کا اعتبار کیا! اور پھر اگر واقعی ایسا ہی ہونے والا ہے تو ان باتوں میں وقت خراب کیوں کریں؟ مجھے جلد کچھ کھا کر سو جانے دیجئے کہ آدھی رات جواب باقی رہ گئی ہے، ہاتھ سے نہ جائے اور چند گھنٹے آرام کروں؟

(۸) گرغم خوریم خوش نہ بود، بہ کہ مے خوریم

حسب معمول چار بجے اٹھا، لیکن طبیعت تھکی ہوئی اور سر میں سخت گرانی تھی۔ میں نے جن سپرین (Genaspirin) کی دو گولیاں منہ میں ڈال کر چائے پی اور قلم اٹھایا کہ بعض ضروری خطوط کا مسودہ لکھ لوں جو رات کی تجویز کے ساتھ پریسیڈنٹ روز

دیٹ وغیرہ کو بھیجنا طے پایا تھا۔ سامنے سمندر میں بھاٹا ختم ہو چکا تھا، اوراس کے ختم ہوتے ہی رات بھر کی اُمس بھی ختم ہوگئی تھی۔ اب جوار کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، اور ہوا کے ٹھنڈے اورنم آلود جھونکے چلنے لگے تھے۔ کچھ تو جن اسپرین نے کام کیا ہوگا، کچھ نسیم صبح گاہی کے ان شفا بخش جھونکوں نے چارہ فرمائی کی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سر کی گرانی کم ہورہی ہے پھر افاقہ کے اس احساس نے اچانک غنودگی کی سی حالت طاری کردی۔

(۹) نسیم صبح ! تیری مہربانی!

بے اختیار ہوکر قلم رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی، پھر اچانک ایسا محسوس ہوا، جیسے سڑک پر سے موٹر کاریں گزر رہی ہوں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ کئی کاریں مکان کے احاطہ میں داخل ہوگئی ہیں اور اس بنگلے کی طرف جارہی ہیں جو مکان کے پچھواڑے میں واقع ہے، اور جس میں صاحبِ مکان کا لڑکا دھیرو رہتا ہے۔ پھر خیال ہوا میں خواب دیکھ رہا ہوں اور اس کے بعد گہری نیند میں ڈوب گیا۔

(۱۰) زہے مراتبِ خوابے کے بہ زبیداری ست!

شاید اس حالت پر دس بارہ منٹ گذرے ہوں گے کہ کسی نے میرا پیر دبایا۔ آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں۔ دھیرو ایک کاغذ ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے، دو فوجی افسر ڈپٹی کمشنر پولیس کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔ گو اتنی ہی خبر میرے لئے کافی تھی مگر میں نے کاغذ لے لیا کہ دیکھوں۔

(۱۱) کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی!

میں نے دھیرو سے کہا، مجھے ڈیڑھ گھنٹہ تیاری میں لگے گا۔ ان سے کہہ دو کہ انتظار کریں۔ پھر غسل کیا کپڑے پہنے، چند ضروری خطوط لکھے اور باہر نکلا تو پانچ بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے۔

(۱۲) کار مشکل بود، ما بر خویش آساں کردہ ایم!

کار باہر نکلی، تو صبح مسکرارہی تھی ۔ سامنے دیکھا تو سمندر اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا۔ نسیم صبح کے جھونکے احاطہ کی روشنی میں پھرتے ہوئے ملے، یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کرر ہے تھے، اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلا تا رہے۔ ایک جھونکا کار میں سے ہوکر گذرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آ گئی۔

(۱۳) صبا وقت سحر بوئے ززلف یار می آورد
دل شوریدۂ مارازنو درکار می آورد!

کار وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن پر پہنچی، تو اس کا پچھلا حصہ ہر طرف سے فوجی پہرہ کے حصار میں تھا، اور اگرچہ لوکل ٹرینوں کی روانگی کا وقت گذرر ہا تھا۔ لیکن مسافروں کا داخلہ روک دیا گیا تھا۔ صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ ہل چل دکھائی دیتی تھی۔ کیونکہ ایک انجن رسٹورنٹ کار کو دھکیل دھکیل کر ایک ٹرین سے جوڑ رہا تھا، معلوم ہوا، یہی کاروان خاص ہے، جو ہم زندانیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے، گاڑیاں کوریڈور کریج (Corridor Carriage) قسم کی لگائی گئی تھیں جو آپس میں جڑ جاتی ہیں، اور آدمی ایک سرے سے دوسرے تک اندر ہی اندر چلا جا سکتا ہے، ٹرین کے اندر گیا تو معلوم ہوا، گرفتاریوں کا معاملہ پوری وسعت کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے، بہت سے آ چکے ہیں، جو نہیں آئے، وہ آتے جاتے ہیں:

(۱۴) بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

بعض احباب جو مجھ سے پہلے پہنچائے جا چکے تھے، ان کے چہروں پر بیخوابی اور ناوقت کی بیداری بول رہی تھی، کوئی کہتا تھا، رات دو بجے یا چار بجے اٹھا دیا گیا۔ کوئی کہتا تھا، بمشکل ایک گھنٹہ نیند کا ملا ہوگا، میں نے کہا معلوم نہیں، سوئی ہوئی قسمت کا کیا حال ہے، اسے بھی کوئی جگانے کے لئے پہنچا یا نہیں؟

(۱۵) درازی شب و بیداری من ، ایں ہمہ نیست
زبخت من خبر آرید تاکجا خفتست!

بہرحال وقت کی گرم جوشیوں میں یہ شکایتیں مخل نہیں ہوسکتی تھیں۔ چونکہ رسٹورنٹ کارلگ چکی تھی اور چائے کے لئے پوچھا گیا تھا، گوپی چکا تھا، لیکن پھر منگوائی اور ان نیند کے متوالوں کو دعوت دی کہ اس جام صبح گاہی سے بادۂ دوشنبہ کا خمار مٹائیں۔

(۱۶) بنوش مے چوسبک رُوحی اے حریف! مدام
علی الخصوص دریں دم کہ سرگراں داری

یہاں بادۂ دوشنبہ کی ترکیب محض جام صبح گاہی کی مناسبت سے زبان قلم پر طاری ہوگئی۔ مگر غور کیجئے، کتنی مطابق حال واقع ہوئی ہے! صرف ایک شام اور صبح کے اندر صورتِ حال کیسی منقلب ہوگئی! کل شام کو جو بزم کیف وسرور آراستہ ہوئی تھی، اس کی بادہ گساریوں اور سیہ مستیوں نے دوپہر رات تک طول کھینچا تھا، لیکن اب صبح کے وقت دیکھئے تو:

(۱۷) نے وہ سرور وسور، نہ جوش وخروش ہے!

رات کی تردماغیوں کی جگہ صبح کی سرگرانیوں نے لے لی، اور مجلس دوشین کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کے بعد جب آنکھ کھلی، تواب صبح خمار کی افسردہ جماہیوں کے سوااور کچھ باقی نہیں رہا تھا:

(۱۸) خمیازہ سنج تہمت عیش رمیدہ ام
مے آں قدر نہ بود کو رنج خمار برد

رات کیفیتیں جتنی تندو تیز ہوتی ہیں، صبح کا خمار بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے، اگر رات کی سیہ مستیوں کے بعداب صبح خمار کی تلخ کامیوں سے سابقہ پڑا تھا، تو ایسا ہونا

ناگزیر تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم شکوہ سنج ہوتے۔ البتہ حسرت اس کی رہگئی کہ جب ہونا یہ تھا، تو کاش، جی کی ہوس تو پوری نکال لی ہوتی اور نپے تلے پیمانوں کی جگہ شیشوں کے شیشے لنڈھا دیئے ہوتے! خواجہ میر درد کیا خوب کہہ گئے ہیں:

(۱۹) کبھی خوش بھی کیا ہے جی کسی رندِ شرابی کا
بھڑا دے منھ سے منھ ساقی! ہمارا اور گلابی کا

ساڑھے سات بج چکے تھے کہ ٹرین نے کوچ کی سیٹی بجائی، حافظ کی مشہور غزل کا یہ شعر کم از کم سینکڑوں مرتبہ تو پڑھا اور سنا ہوگا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کا اصلی لطف اسی وقت آیا۔

(۲۰) کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا ست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے مے آی

بمبئ میں جو افواہیں گرفتاری سے پہلے پھیلی ہوئی تھیں، ان میں احمد نگر کے قلعہ اور پونا کے آغا خان پیلس کا نام تعین کے ساتھ لیا جارہا تھا۔ جب کلیان اسٹیشن سے ٹرین آگے بڑھی، اور پوان کی راہ اختیار کی تو سب کو خیال ہوا غالباً منزل مقصود پونا ہی ہے، لیکن جب پونا قریب آیا تو ایک غیر آباد اسٹیشن پر صرف بعض رفقا اُتار لیے گئے، اور بمبئ کے مقامی قافلہ کو بھی اترنے کے لئے کہا گیا، مگر ہم سے کچھ نہیں کہا گیا اور صدائے جرس نے پھر کوچ کا اعلان کر دیا:

(۲۱) جرس فریاد می دادر کہ بربندید محملہا

اب احمد نگر ہر شخص کی زبان پر تھا۔ کیونکہ اگر پونا میں ہم نہیں اتارے گئے تو پھر اس رُخ پر احمد نگر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہوسکتی۔ ایک صاحب نے جو انہی اطراف کے رہنے والے ہیں بتلایا کہ پونا اور احمد نگر کا باہمی فاصلہ ستر اسّی میل سے زیادہ نہیں، اس لئے زیادہ سے زیاہ دو ڈھائی گھنٹے کا سفر اور سمجھنا چاہئے۔ مگر میرا خیال دوسری ہی طرف

جارہا تھا، احمد نگر یقیناً دور نہیں ہے، بہت جلد آ جائے گا۔ مگر احمد نگر پر سفر ختم کب ہوتا ہے:

(۲۲) فیا دارھا بالخیف، انّ مزارھا
قریب، ولٰکن دون ذلک اھوال

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے، مگر قلعہ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا، تو قصد بھی کیا تھا، مگر پھر حالات نے مہلت نہ دی۔ یہ شہر بھی ہندوستان کے اُن خاص مقامات میں سے ہے، جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ پندرہویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑ گئی۔ تو ملک احمد نظام الملک بھیری نے علم استقلال بلند کیا۔ اور بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر جنیر کی جگہ اسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دارالحکومت یہی مقام بن گیا۔ فرشتہ، جس کا خاندان مازندراں سے آ کر یہیں آباد ہوا تھا، لکھتا ہے، چند برسوں کے اندر اس شہر نے وہ رونق و وسعت پیدا کر لی تھی کہ بغداد اور قاہرہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا۔

(۲۳) کس پایمال آفت فرسودگی مباد
دیروز ریگ بادیہ آئینہ خانہ بود!

ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا، اس کا حصار مٹی کا تھا۔ اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اول نے اسے منہدم کر کے از نو پتھر کا حصار تعمیر کیا، اور اسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر اور ایران تک اس کی مضبوطی کا غلغلہ پہنچا۔ ۱۸۰۳ء کی دوسری جنگ مرہٹہ میں جب جنرل ویلزلی نے (جو آگے چل کر ڈیوک آف ویلنگٹن ہوا) اس کا معائنہ کیا تھا۔ اگرچہ تین سو برس کے انقلابات سہہ چکا تھا، پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق

نہیں آیا تھا۔اس نے اپنے مراسلہ میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوط کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جاسکتی ہے:

(۲۴) کاروان رفتہ واندازۂ جاہش پیداست
زاں نشانہا کہ بہ ہر راہگزار افتادست

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم وشجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنہیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق وفاتر میں محفوظ کرلیا ہے۔

(۲۵) بیفشاں جرعۂ برخاک وحال اہل شوکت ہیں
کہ از جمشید وکیخسر وہزاراں داستان دارد!

اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا کہ جس کی سرگذشت عبدالباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے ہمیں سنائی ہے۔جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کی سیل حبشی کی طاقتور فوج سے ٹکرانا پڑا، تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا، "چنیں انبوہے درپیش (است) وفتح آسمانی۔اگر (شکست) رودہد، جاے نشاں دہید کہ (ما) شمار در یابیم"

خانخاناں نے جواب دیا تھا "زیر لاشہا"

(۲۶) ونحن اناسٌ لاتوسط بیننا
لنا الصدر دون العالمین او القبر!

احمد نگر کے نام نے حافظہ کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکا یک تازہ کردیئے۔ ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جارہی تھی۔میدان کے بعد میدان گذرتے جاتے تھے۔ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گذر رہا تھا۔احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستانِ کہن لیے

ورق پر ورق الٹتا جاتا ایک صفحہ پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا:

(۲۷) گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گرداغہاے سینہ را

مجھے خیال ہوا، اگر ہمارے قید و بند کے لئے یہی جگہ چنی گئی ہے، تو انتخاب کی موزونیت میں کلام نہیں۔ ہم خراباتیوں کے لئے کوءیا ایسا ہی خرابہ ہونا تھا:

(۲۸) با یک جہاں کدورت، باز ایں خرابہ جائیست

دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن میں سناٹا تھا۔ صرف چند فوجی افسر ٹہل رہے تھے۔ انہی میں مقامی چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا۔ جس سے ہمیں ملایا گیا۔ ہم اترے اور فوراً اسٹیشن سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے۔ راہ میں کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اٹھا دیا۔ تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی طرف مڑ سکتے ہیں۔ لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہو جاتی ہے:

(۲۹) ہاں رہ عشق ست، کج گشتن ندار و باز گشت
جرم را ایں جا عقوبت ہست، استغفار نیست!

اسٹیشن سے قلعہ تک کی مسافت زیاہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہوگی۔ قلعہ کی حصار پہلے کسی قدر فاصلہ پر دکھائی دیا۔ پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو گیا۔ اب اس دنیا میں جو قلعہ سے باہر ہے، اور اس میں جو قلعہ کے اندر ہے، صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ چشم زدن میں یہ بھی طے ہو گیا اور ہم قلعہ کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ غور کیجئے تو زندگی کی تمام مسافتوں کا یہی حال ہے، خود زندگی اور موت کا باہمی فاصلہ بھی ایک قدم سے زیادہ نہیں ہوتا:

(۳۰) ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

قلعہ کی خندق، جس کی نسبت ابوالفضل نے لکھا ہے کہ چالیس گز چوڑی اور چودہ گز گہری تھی اور جسے ۱۸۰۳ء میں جنرل ویلزلی نے ایک سو آٹھ فٹ تک چوڑا پایا تھا، مجھے دکھائی نہیں دی۔ غالباً جس رُخ سے ہم داخل ہوئے، اس طرف پاٹ دی گئی ہے۔ اس کا بیرونی کنارہ جو کھدائی کی خاک ریز سے اس قدر اونچا کر دیا گیا تھا کہ قلعہ کی دیوار چھپ گئی تھی وہ اس رُخ پر نمایاں نہ تھا۔ ممکن ہے کہ وہ صورت اب باقی نہ رہی ہو۔

قلعہ کے اندر پہلے موٹر لاریوں کی قطار ملی۔ پھر ٹینکوں کی۔ اس کے بعد ایک احاطہ کے سامنے جو قلعہ کی عام سطح سے چودہ پندرہ فٹ بلند ہوگا اور اس لئے چڑھائی پر واقع ہے۔ کاریں رُک گئیں اور ہمیں اترنے کے لئے کہا گیا۔ یہاں انسپکٹر جنرل پولیس بمبئی نے جو ہمارے ساتھ آیا تھا، ہمارے ناموں کی فہرست کمانڈنگ افیسر کے حوالہ کی۔ فہرست لے کر دروازہ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ یہ گویا ہماری سپردگی کی باضابطہ رسم تھی۔ اب ہماری حفاظت کا سر رشتہ حکومتِ بمبئی کے ہاتھ سے نکل کر فوجی انتظام کے ہاتھ آ گیا اور ہم ایک دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل ہو گئے:

(۳۱) در جستجوے مانہ کشی زحمت سراغ
جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

دروازے کے اندر داخل ہوئے تو ایک مستطیل احاطہ سامنے تھا، غالباً دو سو فٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے تینوں طرف بارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدہ ہے اور بیچ میں کھلی جگہ ہے، یہ اگرچہ اتنی وسیع نہیں کہ اسے میدان کہا جا سکے، تاہم احاطہ کے زندانیوں کے لئے میدان کا کام دے سکتی ہے۔ آدمی کمرہ سے باہر نکلے گا تو محسوس کرے گا کہ کھلی جگہ میں آ گیا۔ کم از کم اتنی جگہ

ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اڑائی جاسکتی ہے۔

(۳۲) سر پر ہجوم درد غریبی سے ڈالئے
وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے

صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ ہے جس میں جھنڈے کا مستول نصب ہے، مگر جھنڈا اتار لیا گیا ہے۔ میں نے مستول کی بلندی دیکھنے کیلئے اسے اٹھایا تو وہ اشارہ کر رہا تھا:

(۳۳) یہیں ملیں گے تجھے نالۂ بلند ترے

احاطہ کے شمالی کنارہ میں ایک پرانی ٹوٹی ہوئی قبر ہے نیم کے ایک درخت کی شاخیں اس پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، مگر کامیاب نہیں ہوتیں۔ قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے۔ طاق اب چراغ سے خالی ہے، مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی ایک دیا جلا کرتا تھا۔

(۳۴) اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں

معلوم نہیں یہ کس کی قبر ہے! چاند بی بی کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اس کا مقبرہ قلعہ سے باہر ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ بہر حال کسی کی ہو، مگر کوئی مجہول الحال شخصیت ہوگی ورنہ جہاں قلعہ کی تمام عمارتیں گرائی تھیں، وہیں اسے بھی گرادیا ہوتا سبحان اللہ! اس روزگار خراب کی ویرانیاں بھی اپنی آبادیوں کے کرشمے رکھتیں ہیں۔ اس پرانی قبر کو ویران بھی ہونا تھا تو اس لئے کہ کبھی ہم زندانیاں خرابائی کے شور و ہنگامہ سے آباد ہو!

(۳۵) کشتوں کا تیری چشم سیہ مست کے مزار
ہوگا خراب بھی تو خرابات ہووے گا!

مغربی رخ کے تمام کمرے کھلے اور چشم براہ تھے۔ قطار کا پہلا کمرہ میرے حصے میں آیا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ جو چارپائی بچھی ہوئی تھی، اس پر دراز ہو گیا۔ نو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری:

(۳۶) ماگوشہ را نہ بہر قناعت گرفتہ ایم
تن پروری بہ گوشہ خاطر رسیدہ است

تقریباً تین بجے سے چھ بجے تک سوتا رہا۔ پھر رات کو ۹ بجے تکیہ پر سر رکھا تو صبح کو آنکھ کھولی:

(۳۷) نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

تین بجے اٹھا تو تازہ دم اور چست وچاق تھا۔ نہ سر میں گرانی تھی، نہ انفلوئنزا کا نام نشان تھا۔ فوراً بجلی کا آلۂ حرارت کام میں لایا۔ اور چائے دم دی۔ اب جام...... سامنے دھرے بیٹھا ہوں۔ آپ کو مخاطب تصور کرتا ہوں اور یہ داستان بے ستون کوہکن سنا رہا ہوں۔

(۳۸) شیریں تراز حکایت مانیست قصہ
تاریخ روزگار سراپا نو شتہ ایم

مہینوں سے ایسی گہری اور آسودہ نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل صبح بمبئی سے چلتے ہوئے جو دامن جھاڑنا پڑا تھا، تو علائق کی گرد کے ساتھ مہینوں کی ساری تھکن بھی نکل گئی تھی۔ یغمائے جندقی کیا خوب کہہ گیا ہے:

(۳۹) غلط گفتی "چرا سجادۂ تقویٰ گرو کردی؟"
بزہد آلودہ بودم، گر نمی کردم، چہ می کردم

یہ اسی غزل کا شعر ہے جس کا ایک اور شعر جو مجتہد کاشان کی نسبت کہا تھا، بہت مشہور ہو چکا تھا:

(۴۰) ز شیخ شہر جاں بردم بہ تزویر مسلمانی
مدارا اگر بایں کافر نمی کردم، چہ می کردم

ردیف کا نبھانا آسان نہ تھا مگر دیکھئے، کس طرح بول رہی ہے، بول نہیں رہی ہے، چینخ رہی ہے۔ میں بھی اس وقت چائے کے فنجان پر فنجان لنڈھائے جاتا ہوں اور اس کا مطلع دہرا رہا ہوں:

(۴۱) زساغر گر دماغ ترنمی کردم چہ می کردم

خدارا، داد دیجئے نظر بہ حالت موجودہ یہاں ''چہ می کردم'' کیا قیامت ڈھا رہا ہے۔ گویا یہ مصرعہ خاص اسی موقع کے لئے کہا گیا تھا۔ مگر یوں پتہ نہیں چلے گا۔ ''چہ می کردم'' پر زیادہ سے زیادہ زور دے کر پڑھئے۔ پھر دیکھئے، صورت حال کی پوری تصویر کس طرح سامنے نمودار ہو جاتی ہے۔

یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں، کلپترہ گوئی اور لا طائل نویسی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم، بحالتِ موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکیں گی۔ یا نہیں! تاہم کیا کروں، افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہی حالت ہوئی جسے مرزا غالب نے ذوقِ خامہ فرسا کی ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا:

مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

ابوالکلام

داستانِ بے ستون وکوہ کن

انگریز حکمران نہیں منظور

آزاد ہند آزاد رہے ضرور: تجویز مصنف

میں نے پہلے ہی اس بات کی وضاحت کی کہ ''غبارے خاطر'' کتاب میں ساہتہ اکیڈمی نے وضاحت سے یہ نہیں لکھا ہے کہ مولانا آزاد صاحب نے کن کن اشعاروں پر یہ خط مرتب لکھے ہیں۔ مانتے ہیں کہ کتاب میں خط کا اجرا ضرور ہے مطلب کس کے نام خط ارسال کیا گیا ہے میں نے یہ بھی لکھا اور اپنی تجویز دی کہ اُن دِنوں انگریزوں کا دور تھا۔ اسی لئے مولانا صاحب خط و کتابت میں اپنے دوستوں کو وضاحت سے باتیں نہیں لکھتے۔ انہیں شک ہوا اس خط و کتابت سے میرے دوستوں کو بھی انگریز حکمران تعزیت دے سکتے ہیں۔ اسی لئے میں داستان بے ستون وکوہ کن کی وضاحت اپنے ہی خیالات کے مطابق کرتا ہوں۔ پہلے پہل میں اس بات کی وضاحت کروں۔ مولانا

صاحب نے عنوان میں یہ صاف لکھا ہے کہ جو میں یہ داستان لکھ رہا ہوں اس میں بہت سی تعزیتیں اور پریشانیاں پیش کرتا ہوں۔ کوہ کن ایک فارسی الفاظ ہے۔ 'کوہ' پہاڑ کو کہتے ہیں۔ 'کن' جو پہاڑ کے چوٹی سے راستہ نظر آتا ہے۔ جس پر ہمیں بہت ہی گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم پہاڑ کا سفر کرتے کرتے کوہِ کن پر پہنچتے ہیں تو ہم ڈرتے ہیں اسی لئے اس الفاظ کو پریشانی کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم پریشانی میں مبتلا ہونا۔

خیر میں یہ وضاحت اپنے طریقے سے یوں کرتا ہوں تاکہ پڑھنے والے کو محسوس ہو جائے کہ مولانا صاحب نے اس خط میں یہی وضاحت کی ہے۔ اسی لئے میں نے اس خط کا عنوان تجویز کیا ہے ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور، انگریز حکمران نہیں منظور'' ان مندرجہ ذیل باتوں کا تذکرہ اپنے خیالات کے مطابق کرتا ہوں:۔

۱۔ جدوجہد میں مصروف

مولانا صاحب میرے خیال میں بمبئی سے اجمل خان صاحب کو اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ ۳؍اگست کا خط وقت پر نہیں ارسال کر سکا کیونکہ اس وقت انگریزوں کی دھڑ پکڑ ہندوستانی سیاست دانوں کے ساتھ دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ مطلب آزادی کے پیروکاروں کے خلاف تیز مہم انگریزی حکمران کر رہے ہیں اسی لئے خط کو دیر ہوئی۔ اسی لئے مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ انشاء اللہ انگریزی حکمران نہیں منظور آزاد ہند آزاد رہے ضرور۔

۲۔ ابھی قید ابھی رہا

میرے خیال میں مولانا صاحب جدوجہد آزادی کے اس خط میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نو مہینے ہوئے۔ ۴؍دسمبر ۱۹۴۱ء کو نینی کے مرکزی قید خانے کے دروازے کھول دیئے گئے اور رہا ہوا۔ پھر ۹؍اگست ۱۹۴۲ء کو سوا دو بجے قلعہ احمد نگر کے

پھاٹک کو بند کر دیا گیا۔لیکن ۹ مہینے کی مدت بظاہر کوئی بڑی مدت نہیں۔۹ مہینے جیل میں رہا، کیونکہ حبِ وطن ہونے کے ناطے اور انگریزی حکمرانوں کو ملک سے دفعہ کرنے کے لئے اتنی تعزیتیں برداشت کیں۔۹ مہینے کا کوئی زیادہ وقت نہیں ہے لیکن میرے لئے بہت ہی ضائع وقت ہے۔ان ۹ مہینوں میں کیا کیا دیکھا اور کیا کیا ،کیا وہ اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے۔

خیر یہ ۹ مہینے اس وقت بہت ہی اہم تسلیم کئے جائیں گے جبکہ یہ کہیں کہ انگریزی حکمران نہیں منظور آزاد ہند آزاد رہے ضرور۔

۳۔گواہ تاریخ

اگر چہ میں ۹ مہینے قید خانے میں رہا۔میں نے محسوس ہی نہیں کیا کیونکہ جب آزاد ہند کا پرچم ہمارے ساتھی لہرائیں گے تو اسی وقت تاریخ دان ان ۹ مہینوں کو تاریخ کے الفاظ میں لکھ کر پڑھنے کے لئے گنجائش اور واقعات درج کریں گے۔یہ تاریخ دان کے لئے ایک اہم خبر موجود رہے گی۔

اسی لئے مجھے پورا یقین ہے کہ خدا کو یاد کر کے آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریزی حکمران نہیں منظور۔

۴۔ورق تاریخ

اس خط کے درمیان ایک تاریخی منظر پڑھنے والوں کے لئے پیش کرتا ہوں گویا یہ داستان ہے۔دستان اِس بات کی کہ کس طرح انگریزی حکمران آزادی کے دوران ہندوستانیوں کو جیل میں اور جیل سے باہر تعزیتیں دے رہے تھے۔اسی لئے یہ آزاد ہند کے لئے ایک تاریخ کا ورقہ رہے گا اور لوگوں کو اس بات کا احساس ہوگا کہ کس کس طرح انگریزی سامراجوں کے ساتھ آزادی کے لئے جدو جہد کرنی پڑی۔اسی لئے

اللہ تعالیٰ کے ذات سے پورا یقین ہے کہ انگریز حکمران نہیں منظور آزاد ہند آزاد رہے ضرور۔

۵۔ منتشر ہوئے کیوں

۴؍اگست کو بمبئی پہنچا اور پہنچ کر ہی بہت سے کام انجام دینے پڑے۔ ان کاموں کو انجام دینے کے لئے مشغول رہا۔ طبیعت ناساز رہی لیکن پھر بھی کام کرنے سے کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی۔ صحت کے نظام میں خلل آہی جاتا ہے لیکن اس خلل کو طریقے سے ٹھیک کرنا لازمی ہے۔ ''۴ سے ۷؍اگست تک ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا'' لیکن اجلاس بہت سے دیکھے اور بہت سے منعقد ہوئے عموماً اس ماحول منتشر بھی رہتا ہے۔ ماحول کو صاف رکھ کر کوئی آلودگی محسوس نہیں ہوتی لیکن منتشر ہونے کے باوجود کاروائی بدستور چلتی رہی۔ یہ کاروائی تب ہندوستانی عوام تسلیم کریں گے جب یہ کہیں گے ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۶۔ ہوتیں ہے تلخیاں

مولانا صاحب نے جب ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں حاضری پائی تو بہت سی گہما گہمی دیکھ کر ورکروں میں رجحان منتشر پایا اور اس منتشر ماحول کو ٹھیک کرنے کے لئے بیماری کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ الجھنیں بہت سی آئیں جیسے کہ ایک آدمی نے استعفیٰ دیا۔ خود مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ابھی تک اس کا استعفیٰ منظور نہیں کیا لیکن پہلے تحریک کی یہ بات چھیڑی گئی کہ گرفتاریاں بہت ہورہی ہے۔ دلّی سے کلکتہ تک ہر شخص کئی افواہیں سن کر منتشر سا محسوس کرتا ہے۔ لیکن سامراج لوگ آزادی نہ ملنے کی وجہ سے ایسی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ لیکن خدا کے فضل سے پورا یقین ہے کہ ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۷۔ افواہ باز کوہِ کن شاذ

مولانا صاحب کہتے ہیں کہ لوگ آزادی کو حاصل کرنے کے لئے پریشان ہیں۔ اس آزادی کو ختم کرنے کے لئے انگریزی حکمران بہت طرح کے الجھنیں ڈالتے ہیں۔ اس میں سے ایک الجھن ہے وہ ہے افواہیں پھیلانا۔ افواہ پھیلانے سے لوگ منتشر رہیں گے۔ جدوجہد آزادی میں خلل پیدا ہوسکتا ہے لیکن انگریز حکمرانوں کو اس بات سے باز رہنا چاہئے وہ ایسی اُلجھنوں میں کامیاب نہیں رہیں گے۔ خدا کے فضل وکرم سے یہی ہے ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۸۔ جوش میں ہوش

آزاد صاحب کہہ رہے ہیں کہ جب اتنی پریشانیاں آزادی کے مہم میں پائی تو صحت میں گڑبڑی محسوس ہوئی۔ مطلب سر میں دَرد محسوس ہوا۔ دوائی کی گولی منھ میں ڈال کر چائے پی لی اور قلم اٹھایا اور خطوط کا مسودہ تیار کیا۔ لیکن میرے خیال میں مولانا آزاد صاحب کہہ رہے ہیں کہ سمندر میں بھاٹا ختم ہوچکا تھا۔ اس کا مطلب یہ کہ لوگوں میں جوش انگریزی تعزیتوں سے کم ہورہا ہے لیکن کسی وقت جوش میں ولولہ بھی آجاتا ہے۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ اب جواہر کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں اور ہوائیں ٹھنڈ اور نم آلود جھونکیں بھیجنے لگی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انگریزوں نے آزادی کی تحریک کو تہس نہس کرنے کے لئے مہم چلائی وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اسی لئے جواہر کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کی گواہی مولانا صاحب اس طرح فرماتے ہیں کہ جب صبح کی ہوا محسوس ہوتی ہے تو اس میں شفا بخش جھونکیں ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب جب لوگ صبح بیدار ہوتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں کیوں نہ آزادی کی ہی ہوا بحال ہوجائے۔ اسی لئے بادِ صبح ان کے لئے موافق

ہے۔ جب ہندوستانی ٹھنڈے دماغ سے مطلب صبح کے ہوا میں محسوس کریں کہ آخر انگریزی سامراجوں سے نجات حاصل ہونا لازمی ہے۔ مولانا صاحب لکھ کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ایسی ہوا کا مزہ یا ماحول نہیں پائیں گے تو غنودگی ضرور محسوس ہوگئی۔ مطلب اگر انگریزی سامراجوں کے ظلم وستم پر جانچ پڑتال نہیں کریں گے تو ہمیں بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی لئے مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب ہمیں اس بات کا پورا اطمینان دل میں آئے گا کہ قوم آزاد ہونا چاہئے تو پھر ہم یہی کہیں گے۔

''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۹۔ رہنما کو رہنمائی کی پریشانی

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب کوئی رہنما قوم کی رہنمائی میں مصروف رہتا ہے تو اس میں بہت سی پریشانیاں دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہیں اور اس کے گرد ونواح بہت سے اراکین آتے ہیں بہت سے نقطوں پر بحث ومباحثہ بھی ہوتے ہیں۔ کئی شکایتیں درست کرنی پڑتی ہیں۔ اسی طرح سے کمرے میں بہت سے لوگ آتے ہیں کبھی گہری نیند میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب رہنمائی کرنی ہو تو پُر اصرار طریقے سے رہنمائی کرنا لازمی ہے ورنہ رہنمائی کا نام ہی نہیں لینا اور اس سے مستعفی ہونا۔ جب آزادی کیلئے رہنمائی کر رہا ہوں اور لوگوں کو اس بات کا احساس دلاتا ہوں۔ ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۱۰۔ جیل کا دروازہ پرانا نہیں

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب آنکھ کھلی تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فوجی، ایک کاغذ ہاتھ میں لے کر یہ کہہ رہا ہے کہ جیل کی تیاری کرو۔ لیکن میں پر اطمینان طریقے سے جیل جانے کے لئے تیار ہوں، کیونکہ ملک کو آزاد کرنا ہے۔ انشاء اللہ

"آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۱۱۔ کچھ دیر سہی کچھ پھیر سہی

میرے خیال میں مولانا صاحب اپنے دھیرو سے کہہ رہے ہیں کہ انہیں کہو جیل جانے کے لئے تیار ہوں لیکن کچھ دیر انتظار کرو۔ پہلے غسل کرنا، کپڑے بدلنا اور اس کے بعد تیاری کرنی لازمی ہے۔ حکمرانوں کے حکم کی تعمیل کرنی ہے اس بات کے لئے تعمیل کرنی ہے کہ ہم ہندوستانی آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے انگریزی حکمران آزادی کے الفاظ برداشت نہیں کرتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کو آخر کار ملک سے بھاگنا ہی پڑے گا۔ خدا کی مدد سے "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۱۲۔ خدا بھی خوش ہے

میرے خیال میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب حکمرانوں نے انہیں جیل بھیجنے کی تیاری کی تو ان کے ہی ایلچی آئے اور میں نے انکار نہیں کیا۔ خوش حال طریقے سے باہر آیا۔ کار باہر نکلی صبح کا وقت تھا سامنے دیکھا سمندر اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔ مطلب میرے قید کرنے سے ہندوستانی لوگ بہت ہی خوش رہے وہ میرے لئے قربانی دینے کے لئے تیار ہیں اور نسیم صبح کے جھونکوں کے احاطہ کی روشنی میں پھیرتے ہوئے ملے۔ مطلب جب بھی لوگ سنیں گے کہ مولانا صاحب کو پھر انگریزی سامراجوں نے قید کیا تو میری تعریف کریں گے اور میری قربانی پر ناز و نکھرے کریں گے۔ میری قربانی پر وہ اعتماد رکھیں گے کہ ہم ضرور انگریزی حکمرانوں سے آزاد ہو جائیں گے۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ پھولوں کی خوشبوں چن چن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے۔ مطلب جو بھی نونہال پودا آزادی کے بعد میرے کارنامے پڑھے گا انہیں آزادی کا ماحول اور آزادی حاصل کرنے کی قربانیاں

یاد رہیں گی۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا رہے ایک جھونکا کار میں سے ہوکر گزرا تو بے اختیار حافظ غزل یاد آگئی۔

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں حکمرانوں کی کار میں بیٹھا مطلب گرفتار ہوا تو جس کار میں بیٹھایا گیا اس کار میں مجھے کوئی غم اور شکوہ محسوس نہیں ہوا۔ بیٹھتے بیٹھتے مجھے حافظ کی غزل یاد آگئی۔ جس کا مفہوم یہ ہے جب صبح کے وقت دیکھتے ہیں تو ہمیں دلی خوشی محسوس ہوتی ہے یہ خوشی محسوس کرتے کرتے ہمارے دلوں میں کوئی بھی غم نہیں جو پہلے سے موجود ہوتا ہے اور اس کو بھی صبح کی ہوا سے بھولا دیتے ہیں۔ لیکن بھولتے بھولتے خدا سے یہ بھی گذارش کرتے ہیں کہ اُن غموں کی توفیق عطا فرمائے۔ اسی لئے مولانا صاحب فرماتے ہیں جب یہ غزل یاد آئی تو مجھے پورا یقین رہا۔ اللہ تعالیٰ انگریزی سامراج کو نیست و نابود کر کے رکھے گا اور پورا یقین رہا "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۱۳۔ حالت ہوئی کیا حالت سے خوش نہیں

میرے خیال میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب ریلوے اسٹیشن پہنچا تو وہاں فوجی پہرہ نظر آیا۔ کوئی بھی باشندہ نظر نہیں آیا اور لوکل ٹرینوں کی روانگی کا وقت گذر رہا تھا، لیکن مسافروں کا داخلہ روک دیا گیا تھا صرف ایک پلیٹ فارم پر کچھ ہلچل دکھائی دیتی تھی کیونکہ ریل کا انجن دوسرے انجن سے ٹکرا کر تتر بتر حالات دیکھنے میں آئے۔ لیکن مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ یہ کاروانِ خاص ہے۔ گاڑیوں کو آنے جانے کے لئے روکا گیا تھا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ جب ایسے حالات میں نے گرفتاری کے دوران دیکھے تو مجھے پورا یقین آیا کہ لوگوں سے انگریزی سامراج ڈر رہے ہیں۔ اگر گرفتار کرنا ہے تو

لوگوں کے بغیر کیوں۔ مطلب لوگوں کو جب خبر پہنچتی تو کچھ نہ کچھ حالات بگڑ جاتے۔ امن میں خلل نہیں بلکہ لوگوں کے امن پسند مظاہرے سامنے نظر آتے۔ میری گرفتاری سے لوگوں کا کارواں انگریزی سامراج دیکھ کر لرزتی، خفیہ جیل میں بھیجا گیا۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ میری گرفتاریوں کا معاملہ پوری وسعت کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے بہت سے آئے ہیں اور بہتوں کا آنا لازمی ہے۔ میرے خیال میں مولانا صاحب یہ فرماتے ہیں کہ جس ٹرین میں مجھے فوجیوں نے بٹھایا اسی ٹرین میں باقی قیدیوں کو بھی لایا گیا ہے۔ جب یہ حال دیکھا تو مجھے پورا یقین ہوگیا کہ خدا میرے ساتھ ہے اور ہماری آخر فتح ہوگی۔ وہ فتح ان الفاظوں سے پوری ہوگی کہ "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۱۴۔ کی دوستی جیل میں

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ میرے سے پہلے بہت لوگوں کو اس ٹرین میں گرفتار کر کے بٹھایا گیا تھا، کوئی کہتا تھا کہ رات دو بجے سویا اور ۴ بجے اٹھادیا گیا۔ کوئی کہتا تھا کہ بمشکل ایک گھنٹہ نیند کا ملا ہوگا۔ مولانا صاحب فرمارہے ہیں کہ معلوم نہیں کہ سوئی ہوئی قسمت کا کیا حال ہے۔ اسے بھی کوئی جگانے کے لئے پہنچا یا نہیں۔

مطلب اور جو لوگ گرفتار کرنے ہے ان کی قسمت کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔ میرے خیال میں مولانا فرماتے ہیں کہ ان گرفتاریوں سے بہت حد تک میں پریشان رہا۔ کتنی تعزیتیں انگریز لوگ ہم ہندوستانیوں کو دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری مانگ پوری کرے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا یہ خواب پورا کرے کہ "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۱۵۔آپسی بھائی چارہ

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب بہتوں کی گرفتاری ہوئیں تو چائے کے لئے ترسنے لگے۔چائے نہیں منگوا سکتے کیونکہ قیدی ہونے کے ناطے کیسے منگواتے۔مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ صبح چائے پینے کی ہمیشہ عادت رہی ہے لیکن چائے کی تلخی سے بہت متاثر رہا۔میرے خیال میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ اگرچہ چائے کی توقع پوری نہ ہوتو پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ ہماری توقع جس جدوجہد کی ہے وہ پوری ہو کر ہی رہے گی۔ ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۱۶۔کیا بتاؤں دوستوں آگے کا حال

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب چائے کی تلخی پوری نہیں ہوئی ،ہمارے مطالبے پر غور ہی نہیں ہوا۔ایک شام اور صبح کے اندر صورت حال کیسی منقلب ہوگئی ہے۔کل شام کو بزم کیف وہ سرور آراستہ ہوئی تھی اس کی بادہ گساریوں اور سیہ مستیوں نے دوپہر رات تک طول کھینچا تھا لیکن اب صبح کے وقت دیکھئے تو۔مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب ریل میں سفر کر رہے تھے کسی کو بھی معلوم نہیں آخر کہاں جانا ہے کدھر قیام کریں گے یہی سوچتے سوچتے مجھے اس بات پر غور کرنا پڑا کہ جو میرے ساتھی میرے ساتھ سفر کر رہے ہیں ان کا صورتحال منتشر ہوگا۔

مطلب کل شام اور صبح کے اندر،وہ لوگ اپنے اپنے خیالات سوچتے تھے لیکن یہ نہیں معلوم تھا انہیں انگریزی حکمران ریل میں بحیثیتِ سیاسی قیدی سفر کرائیں گے۔یہ خدا کو ہی معلوم تھا لیکن یہ حال دیکھ کر سب لوگ سوچتے ہوں گے کب وہ صبح آئیگی کہ ہم گنگناتے ہوئے نغمے صبح کے سن کر خوش مزاج رہیں گے۔

مطلب مولانا فرماتے ہیں کہ اگر ان سیاسی قیدیوں کو انگریزی حکمرانوں نے

بہت سے تعزیتیں دیں لیکن ہم وہ صبح اس وقت حاصل کریں گے جب "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۱۷۔ جذبے وطن

مولانا آزاد صاحب فرما رہے ہیں کہ رات کی تردماغیوں کی جگہ صبح کی سرگرانیوں نے لے لی اور مجلس دوشین کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کے بعد جب آنکھ کھلی تو اب صبح خمار کی افسردہ جماہیوں کے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ میرے خیال میں مولانا صاحب فرما رہے ہیں کہ ہم ٹرین میں رات دن سفر کرتے رہے پھر بھی ہمیں معلوم نہیں کہ حکمران ہمیں کہاں پہنچا رہے ہیں۔ آخر کسی کو خیال ہی نہیں کہاں جانا ہے اور کہاں ٹھہرنا ہے۔ لیکن ہمیں پورا یقین ہے کہ ہمارا ٹھہراؤ تب باعمل ہوگا جبکہ ہماری مانگ پوری ہو۔ "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۱۸۔ وطن کا خیال

مولانا صاحب فرماتے ہیں۔ رات کی کیفیتیں جتنی تندو تیز ہوتی ہیں صبح کا خمار بھی اتنا ہی سخت ہوتا ہے۔ رات کی سیاہ مستیوں کے بعد اب صبح خمار کی تلخ کامیوں سے سابقہ پڑا تھا۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ بہت ہی تنگ دستی اور غمزدگی پیدا ہونے لگی۔ کیونکہ معلوم نہیں کہ کہاں جانا ہے کہاں سے آئے۔ اگر چہ کوئی آدمی رات کو سوتا ہے صبح جب وہ اٹھتا ہے تو اسے رات کے کام کی یاد آ ہی جاتی ہے۔ لیکن ہم رات اور دن ایک ہی انداز سے دیکھتے رہے۔ کوئی بھی سیاسی قیدی یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ اسے شکوہ و رنج ہے۔ سب آپس میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ جیسے کہ یہ حال دیکھ کر مولانا صاحب کو میر درد کا یہ شعر یاد آیا۔ جب کوئی شراب پیتا ہے تو اس کے پینے سے پہلے رِند کی خدمت یاد آتی ہے۔ اور رِند کو اچھے طریقے سے پیش آتا ہے۔ لیکن نہ

ہمارے پاس اس سفر میں رند ہے اور نہ تعریف کرنے والے شخص کی شناختگی ہے۔ پھر بھی ہم آپس میں نہ کہنے کے باوجود برداشت کرتے ہیں۔

مولانا صاحب فرمارہے ہیں کہ کوئی بھی حالت محسوس ہوتی ہے تو ہماری فتح یابی کے بعد ہماری یاد ان لوگوں کو آئے گی جو ہماری اس قربانی سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اور ہمیں اس قربانی پر پورا یقین ہے کہ "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۱۹۔ دیکھئے حال کیا ہے؟

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ساڑھے سات بج چکے تھے کہ کھٹرین نے کوچ کی سیٹی بجائی۔ حافظ کی مشہور غزل کا یہ شعر کم از کم سینکڑوں مرتبہ پڑھا اور سنا ہوگا لیکن یہ شعر مجھے اسی وقت یاد آیا کہتے ہیں کہ معلوم نہیں کس منزل پر جانا ہے اور کہاں سے آئے ہیں۔ چوبیس گھنٹے ہمارے دل میں یہی ہے کہ رات کیا ہے اور دن کیا ہے۔ اذان کی آواز بھی کانوں میں نہیں آتی ہے۔ خدا کو شاید ہم بھول ہی گئے ہیں لیکن ہم دل سے خدا کو یاد ضرور کرتے رہتے ہیں۔

اسی لئے اگرچہ میں سفر میں ہوں تو اشاروں سے ہی نماز ادا کرتا ہوں اور دل سے بانگ سنتا ہوں۔ مطلب مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ اگرچہ انگریزی سامراجیوں نے مذہبی تعلقات بھی درہم برہم کئے ہمیں پرواہ نہیں۔ ہم آزادی کے لئے لڑ پڑے ہیں اور پوری توقع ہے کہ خدا کی مدد سے ہمارا نعرہ عمل پزیر ہوگا۔ وہ یہ "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۲۰۔ فقط دیکھتا ہوں کارواں سفر کا

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ بمبئی میں جو افواہیں گرفتاری سے پہلے پھیلی ہوئی

تھیں کہ ان میں احمد نگر کا قلعہ اور پونا کے آغا خان پیلس کے نام لیا جارہے تھے۔ جب کلیان اسٹیشن سے ٹرین آگے بڑھی اور پونا کی راہ اختیار کی تو سب کو خیال ہوا کہ غالباً منزل مقصود پونا ہی ہے۔ جب پونا قریب آیا تو ایک غیر آباد اسٹیشن پر صرف بعض رفقاء اتار لئے گئے اور بمبئی کے مقامی قافلہ کو بھی اتارنے کے لئے کہا گیا۔ مگر ہم سے کچھ نہیں کہا گیا اور صدائے جرس نے پھر کوچ کا اعلان کر دیا۔ میرے خیال میں مولانا صاحب ایسے واقعات بیان کر کے بتا رہے ہیں کہ کس طرح آزادی کے مجاہدوں کو اور آزادی کے لڑنے والے قیدیوں کو انگریزی سامراجوں نے تعزیتیں دی۔ کسی قیدی کو اُدھر اور کسی قیدی کو اِدھر۔ یہ حال دیکھ کر میں پریشان رہا اور خوش بھی رہا۔ پریشانی اس بات کی رہی کہ کسی کو کسی کی خبر نہیں انگریزی سامراجیوں کا یہی نصب العین ہے۔ لیکن ایسے واقعات کو ہم نہیں بھولیں گے اور مؤرخین ان واقعات کو سنگ میل کی حیثیت سے اپنے ورقوں میں بیان کر کے رہینگے۔ اور پڑھنے والے یہ حال پڑھ کر ہمارا ہی یقین کریں گے ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۲۱۔ سمجھ نہیں آتا ناداں ہوں

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ اب احمد نگر ہر شخص کے زبان پر تھا کیونکہ پونا میں اگر ہم نہیں اتارے گئے تو پھر اس رُخ احمد نگر کے سوائے اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ ایک صاحب نے جو انہی اطراف کے رہنے والے ہیں بتلایا کہ پونا اور احمد نگر کے باہمی فاصلہ ستّر اسّی میل سے زیادہ نہیں۔ اسی لئے زیادہ سے زیادہ دوڑھائی گھنٹے کا سفر اور سمجھنا چاہیئے۔ لیکن مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ دوسری ہی طرف جارہا تھا احمد نگر یقیناً دور نہیں ہے بہت جلد آجائے گا۔ مگر احمد نگر پر سفر ختم کب ہوتا ہے۔

مولانا صاحب یہ لکھ کر بتا رہے ہیں کہ کتنی گھما گھمی سیاسی قیدیوں میں رہی کہ وہ

کسی نہ کسی جگہ قیام کریں ۔لیکن انگریزی سامراجیوں نے اس سفر سے ہمیں قیام کرنے کا موقعہ ہی فراہم نہیں کیا۔ کیونکہ ٹرین کے سفر سے انگریزی سامراجوں نے مختلف طریقوں سے سیاسی قیدیوں کو تعزیتیں دی اور ان تعزیتوں سے میں تنگ نہیں آیا میں خوش ہوں۔ لیکن تعزیتوں کو اس وقت دوہرائیں گے جب ہمارا نعرہ باعمل آئے گا۔ ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۲۴۔تذکرۂ واقعات

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ملک کے تمام تر تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے مگر قلعہ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا تو ارادہ کیا تھا مگر پھر حالات نے مہلت نہ دی کہ یہ شہر بھی ہندوستان کے ان خاص مقامات میں سے ہیں جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں وابستہ ہوگئیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ پندرہویں صدی کے آواخر میں جب دکن کی حکومت کمزور ہوگئی تو ملک احمد نظام الملک بیری نے علم استقبال بلند کیا۔ اور بھینگر کے قریب احمد نگر کے بنیاد ڈال کر اس سے حاکم نشین شہر بنایا۔ اس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دارالحکومت یہی مقام بن گیا۔ فرشتہ جس کا خاندان مازندان سے آکر یہیں آباد ہوا تھا۔ وقت پر بغداد اور قاہرہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا۔

مولانا صاحب قلعہ احمد نگر کے تاریخ کے بارے میں فرمارہے ہیں اور اس جگہ کے واقعات کے بارے میں بیان کرتے ہیں اور اس سے یہ نصیحت دے رہے ہیں کہ قلعہ احمد نگر کا وجود کیسے ہوا۔ اور اس کی قربانی پر کتنے شخصیات کی کہانیاں مدنظر ہیں۔ میرے خیال میں مولانا صاحب ان واقعات کو دہراتے ہیں۔ ہندوستانی شہریوں کو کہہ رہے ہیں کہ کسی تاریخی مقام کا نام دہراؤ اور خود اس وقت جدوجہد آزادی

میں مصروف ہونے کی وجہ سے کبھی تاریخی مقام نہیں دیکھا۔ بہت دفعہ کوشش کی اور ارادہ بھی کیا کہ تاریخی مقام دیکھوں۔ لیکن آزادی کی جدوجہد کی وجہ سے نہیں دیکھ سکا۔ اگرچہ میں نے یہ تاریخی مقام نہیں دیکھا پھر بھی ہندوستانیوں کو جیتنے کے لئے اوران کی آزادی کو حاصل کرنے کے لئے میرا تاریخی مقام یہی ہے کہ ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۲۳۔تاریخ گواہ ہے

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا اس کا حصار مٹی کا تھا اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اول نے اسے منہدم کر کے از سر نو پتھر کا تعمیر کیا اور اس سے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر اور ایران تک اس کی مضبوطی کا غلغلہ پہنچا۔ میرے خیال میں مولانا صاحب نے اس تاریخ کا واقعہ اسی لئے بیان کیا ہے تاکہ ہندوستانیوں کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ واقعات رونما ہونے کے بعد تاریخ کا ورقہ لکھتے ہیں اسی لئے جب ہم آزادی کے لئے لڑیں گے تو ہمارا نام اسی طرح دہرایا جائیگا۔ جس طرح تعمیر ملک احمد نے قلعہ کو کیا اور آزادی حاصل کرنے کے بعد قلعہ کی طرح لوگ ضرور ہمارے نام پر کچھ نہ کچھ یادگار بنائیں گے۔

اسی لئے مولانا فرماتے ہیں کہ خدا ضرور ہماری یادگار کے لئے یہ امید پوری کرے گا۔ ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۲۴۔تاریخ حوصلہ

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم وشجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنہیں تاریخ نے پتھر

کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق و فاتر میں محفوظ کر لیا ہے۔

میرے خیال میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمیں آزادی کے دوران کئی جانوں کو ضائع ہونا لازمی ہے کیونکہ انگریزی سامراج ہماری جدوجہد کے دوران کئی قسم کے حربے استعمال کر کے اور جلسوں میں تتر بتر کرنے کے لئے مار پیٹ کا سامنا کرنے پڑے گا۔ جو جانیں تلف ہو جائیں گی ان کی یادگار اسی طرح تعمیر کریں گے جس طرح احمد نگر کا قلعہ۔

اسی لئے مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب ہم آزادی حاصل کریں گے اس کے بعد ہم اپنے ملک میں ان شہیدوں کے یاد میں مختلف یادگار ان کے نام کی تعمیر کریں گے۔ اسی لئے اگر چہ ہم اس ٹرین میں سفر کر رہے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ انگریزوں کی تعزیتیں نہیں دہرائی جائینگی۔ ہماری آنے والی نسل ان کارناموں کو دہرائیگی۔ جب ہمارا مطالبہ پورا ہو جائے۔ وہ یہی ہے۔ "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۲۵۔ بنیاد تاریخ کا

اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خانخانان کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا کہ جس کی سرگذشت عبدالباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے ہمیں سنائی ہے۔ جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں اور خانخانان کی قلیل التعداد فوج کی سیل حبشی کی طاقتور فوج سے ٹکرانا پڑا، تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا۔

مولانا صاحب فرما رہے ہیں کہ تاریخ کی بنیاد کبھی مسترد نہیں ہوتی۔ مؤرخ ہر ایک واقعہ کو قلم بند کرتا ہے۔ میرے خیال میں مولانا صاحب احمد نگر کا تاریخی واقعات بیان کر کے ہر شہری ہر ہندوستانی کا دل اُجاگر کرتا ہے تاکہ ان کے دلوں میں آزادی کا

ولولہ اور آزادی کے لئے اپنی بہادری قائم اور دائم رہے۔ اسی لئے فرمارہے ہیں کہ ان واقعوں سے حب الوطنی کا جوش پیدا ہو جائے گا اور پورا یقین ہے کہ ہماری جیت ایسی ہوگی کہ ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۲۶۔ کہانی کو دہرانا

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ احمد نگر کے نام نے حافظہ کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکا یک تازہ کردیئے۔ اور کہہ رہے ہیں کہ ریل تیزی کے ساتھ دوڑتی ہے اور ریل کا سفر کرتے کرتے بہت ساری جگہیں دیکھ کر ایک نیا سا منظر دیکھنے میں آتا ہے لیکن اس منظر کو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن ہمارے دماغ میں کہانی یاد آتی ہے اور سفر کرتے کرتے اور جگہ کو دیکھ کر یاد اشت کو دہراتے ہیں اور واقعات کو دہراتے ہیں۔ جب ہم ریل میں سفر کرتے ہیں کئی تاریخی مقام سامنے نظر آتے ہیں لیکن قیدی ہونے کے ناطے ہماری آنکھیں پراصرار طریقے سے نہیں ٹھہرتی۔

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ اب ہم ان تاریخی مقامات کو ٹھیک طریقے سے دیکھتے لیکن ریل تیز تیز دوڑتی چلی گئی۔ سیاسی قیدی ہونے کی وجہ سے ہماری مانگیں پوری نہیں ہوسکتی ہیں۔ اسی لئے مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ سیاسی قیدی ہونے کی وجہ سے ریل میں سفر کررہا ہوں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جب ہندوستانی آزادی حاصل کریں گے تو اس وقت وہ جب بطور آزادی ہندوستان کے شہری بن کر ریل میں سفر کریں گے تو ان تاریخی مقامات کو ٹھیک طرح سے دیکھیں گے اور ہمارے سفر کو بھی یاد کریں گے کہ کس طرح آزادی کو حاصل کرنے کیلئے قربانیاں ہمارے رہنماؤں کو دینی پڑیں اور ہم سے توقع یہی کی ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۲۷۔ خیال پورا نہیں

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب سیاسی قیدی ہونے کی وجہ سے ریل میں سفر کرتا رہا انہیں پورا یقین ہوا کے اگر انگریزی حکمرانوں نے اسی جگہ کو قید رکھنے کے لئے شناخت کیا تو ہمیں کوئی شکوہ نہیں۔ لیکن نہ معلوم کس جگہ کس مقام پر پہنچنا ہے۔

میرے خیال میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ کس کس طرح کی تعزیتیں انگریزی سامراجیوں سے حاصل ہوئیں اور حاصل کرتے ہیں کیونکہ ہمیں ملک میں اپنی حکومت تشکیل دینے کیلئے اور آزاد ماحول رکھنے کے لئے قربانی دینی لازمی ہے۔ لیکن اتنا سفر کرنے کے باوجود ہم آزادی کا نعرہ منسوخ نہیں کریں گے ہم یہی کہیں گے ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۲۸۔ فولاد ہے دل میرا

دو بجنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچی۔ اسٹیشن میں سناٹا تھا۔ صرف چند فوجی افسر ٹہل رہے تھے۔ انہی میں مقامی چھاؤنی کا کمانڈنگ آفیسر بھی تھا۔ جس سے ہمیں ملایا گیا۔ ہم اترے اور فوراً اسٹیشن سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے۔ راہ میں کوئی موڑ نہیں ملا۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اٹھا دیا۔ تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتا۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی طرف مڑ سکتے ہیں۔ لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے سے بند ہو جاتی ہے۔

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جو فوجی افسر ہمارے ساتھ ہیں وہ بھی تھک گئے وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ انہیں بھی کتنا وقت ان کے ساتھ گزارنا پڑا۔ لیکن ان کو بھی محسوس ہوا کہ انہیں ظلم سہی طور ہے۔ انہی مقاموں میں چھاؤنی کا افسر بھی حاضر رہا۔ اس نے سب کو بلایا۔ ہماری گنتی لے لی لیکن اتر کر اور پھر اگلے اسٹیشن تک روانہ

ہوئے۔ اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک تھی راستے میں کوئی موٹر گاڑی کی آواز ہی سننے میں نہیں آئی۔

ایسا سفر دیکھتے ہیں جیسے سنسان سڑک کے چاروں طرف محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن ہمیں فوجی افسروں کا حکم تھا کہ جب ٹرین میں سفر کرو گے تو سفر کرتے کرتے آگے کی طرف گردن رکھنی ہے پیچھے کی طرف موڑنا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہمیں پیچھے موڑنے کی اجازت ہوتی ممکن ہے کوئی شہری ہم پر نظر ڈال کر محسوس کرتا کہ انگریزی حکمرانوں نے سیاسی قیدی کسی خاص ٹرین میں رکھیں ہیں۔ لیکن فوجی افسروں کو اجازت ہی نہیں تھی۔ میرے خیال میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ اتنی بھی سختی ہم پر ڈالی گئی پھر بھی ہم محسوس کرتے ہیں اور خدا سے یہی مانگتے ہیں کہ "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۲۹۔ آخر ٹھہرے کہاں

اسٹیشن سے قلعہ تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہوگی۔ قلعہ کا حصار پہلے کسی قدر فاصلہ پر دکھائی دیا۔ پھر یہ فاصلہ چند لمحوں میں طے ہو گیا۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب ہم اسٹیشن سے قریب پہنچے تو بارہ منٹ کے فاصلہ رہا۔ قلعہ کا حصار پہلے کسی قدر فاصلہ پر دیکھائی دیا۔ مطلب ہم قلعہ کے نزدیک پہنچ کر چشمے زون طے کیا اور ہم قلعہ کے اندر داخل ہو گئے۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ زندگی کی تمام مصیبتوں کا یہی حال رہا۔ کیونکہ قلعہ سے آگے اور قلعہ سے پیچھے ایک قدم بھی زیادہ اُدھر اِدھر جانے کی اجازت ہی نہیں۔ جب ہم پر اس طریقے کے حکم صادر کیئے گئے تو ہمیں محسوس ہوا کہ انگریزی حکمران کس کس طرح سے ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ میرے خیال میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارے ساتھ ہیں اور ان کے

ساتھ ہونے کا ہمیں پورا یقین ہے کہ "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۳۰۔آزادی کے قیدی نہیں بلکہ انگریزوں کے غدار

قلعہ کی خندق، جس کی نسبت ابوالفضل نے لکھا ہے کہ چالیس گز چوڑی اور چودہ گز گہری تھی اور جسے ۱۸۰۳ء میں جنرل ویلزلی نے ایک سو آٹھ فٹ تک چوڑا کرایا تھا، مجھے دکھائی نہیں دی۔ غالباً جس رُخ سے ہم داخل ہوئے، اس طرف پاٹ دی گئی ہے۔اس کا بیرونی کنارہ جو کھدائی کی خاک ریز سے اس قدر اونچا کر دیا گیا تھا کہ قلعہ کی یوار چھپ گئی تھی وہ اس رُخ پر نمایاں نہ تھا۔ ممکن ہے کہ وہ صورت اب باقی نہ رہی ہو۔

مولانا صاحب قلعہ کی تصویر چٹھی میں تحریر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جب ہم قلعہ کے اندر داخل ہوئے اس وقت قلعہ کے اندر موٹر لاریوں کی قطار ملی، پھر ٹینکوں کی بھی قطار ملی۔

یعنی مولانا صاحب فرماتے ہیں جیسے ہمیں محسوس ہوا کہ کوئی جنگی قیدی جنگ کے میدان سے لائے گئے ہیں اتنی حفاظت چاروں طرف دیکھنے میں آئی۔ کاریں رک گئیں اور ہمیں کاروں سے اتارا گیا۔ وہاں انسپکٹر جنرل پولیس بمبئی موجود تھا جو کہ ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اس نے سیاسی قیدیوں کی فہرست فوجی افسر کے حوالے کی۔فہرست وصول کر کے دروازہ کھولا۔ مطلب ہماری سپردگی باضابطہ سرکاری طور پر ہوئی۔اب مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ہماری حفاظت بمبئی سرکار کے ہاتھ سے چھینی گئی اور فوجی حکمرانوں کے ہاتھ میں آئی۔

اس کا مطلب ایک دُنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں داخل کیا۔ مطلب پولیس افسروں سے رہا ہو کر فوجی افسروں کے ہاتھ میں ہمارا مستقبل رہا۔ میرے خیال میں

مولانا فرماتے ہیں کہ پولیس ہو یا فوجی ہو دونوں انگریزی حکمرانوں کے ملازم ہیں۔ جو بھی انگریزی حکمران ان پر حکم صادر کریں گے انہیں اس حکم نامہ کی تعمیل کرنی ہے۔ گویا انگریزی حکمرانوں کے مظالم تب تک ہم پر قائم ودائم ہیں جب تک خدا ہماری تحریک کو کامیاب نہ کرے کہ ہماری امیدیں اس طرح پوری ہونی چاہئے تاکہ ہم محسوس کریں ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۱۳۱۔قیدیوں کا قیام

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب قید خانے کا دروازہ کھولا گیا تو غالباً دو سوفٹ لمبا اور ڈیڑھ سوفٹ چوڑا احاطہ نظر آیا۔ اور اس کے اندر بارک کمروں کا سلسلہ دیکھنے میں آیا۔ بیچ میں کھلی جگہ بھی دیکھی لیکن میدان جیسا نظر آیا۔ جب کوئی قیدی باہر نکلے گا تو کھلی جگہ محسوس کرے گا۔ لیکن اتنی جگہ سیاسی قیدیوں کو محسوس ہوتی ہے کہ وہ کھلے طور سے باتیں کر سکتے ہیں۔ یہ احاطہ دیکھ کر مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ سیاسی قیدی کے حیثیت میں عزت نہیں بلکہ ایک غدار کی حیثیت سے عزت دیکھی۔ اگرچہ ہم لوگوں کے رہنما ہیں لیکن رہنمائی کو انگریزی حکمران تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ میرے خیال میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمیں قید خانے میں ہمارے ساتھ قیدی کا ہی سلوک کیا یا جا رہا ہے لیکن قید کے باہر ہمارے لوگ ہمیں رہنما کے طرز سے عزت بخشتے ہیں۔ وہ ہماری باتوں پر چلتے ہیں۔ یعنی انگریزی حکمران ہمارے خلاف ہیں اور دوسرے لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ لوگوں کے لئے ہم اس قید خانے میں اس طریقے کا ظلم وستم برداشت کرتے ہیں تاکہ ہمارے ارادے اس طریقے سے باعمل بنیں تاکہ ہم یہ کہیں ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۳۲۔قید خانے میں استقبال

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ہم سیاسی قیدی ہیں لیکن انگریزی حکمرانوں کے طور طریقے سے ہم قیدی ہیں سیاسی نہیں۔اس کے باوجود اس قید خانے کے صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ ہے جس میں پرچم اتارنے اور چڑھانے کی جگہ ہے۔مگر جس وقت ہم قید خانے میں داخل ہوئے اس وقت جھنڈا اتار دیا گیا۔میرے خیال میں مولانا فرماتے ہیں کہ یہ جھنڈا دیکھ کر سوچنے لگے کہ جب بھی ہم ہندوستانی آزاد ہو جائیں گے تو اس وقت تمام جیلوں میں ہمارے ہی پرچم لہرائے جائیں گے۔اور ہمارے جھنڈے کا احترام عوام ضرور کریں گے کیونکہ ہم نے یہ جھنڈا تسلیم کرایا ہے۔اسی لئے اس پرچم کو عوام خود بخود عزت واحترام کرے گی یہ تب ممکن ہے جب ہمارا ملک ہندوستان انگریزی حکمرانوں سے آزاد ہوگا۔پورا یقین ہے کہ "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۳۳۔یادگارِ نیک شخص

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جیل کے احاطے کے شمالی کنارہ میں ایک قبر دیکھنے میں آئی۔یہ قبر نیم کے درخت کے سائے تلے دیکھی۔قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے۔طاق اب چراغ سے خالی ہے محراب اپنی رنگت بھول گئی ہے۔مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے یہ دیکھ کر محسوس ہوا کہ یہاں کبھی دیا جلا کرتا تھا۔میرے خیال میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے کسی نیک آدمی کی قبر دیکھی جس کا احترام لوگ کرتے رہے۔انگریزی حکمرانوں نے اس احترام کو بالائے طاق رکھا ہے۔وہ یہ کہ اب انگریزی حکمرانوں کی وجہ سے اس قبر پر کوئی دِیا ہی نہیں جلا سکتا ہے کیونکہ خود مولانا صاحب کو محسوس ہوا کہ کبھی ایک دِیا جلا کرتا تھا۔مولانا صاحب کہہ

رہے ہیں کہ بزرگوں اور خدا پرستوں کی یادگار انگریزی حکمرانوں نے مٹا کے رکھی ہے۔ جب کہ ہمارا ملک آزاد ہوگا تو پھر اس یادگار کو پھر سے بحال کیا جائے گا اور اس یادگار کو احترام کے لئے عوام کے لئے کھلا رکھیں گے پہلے پہل جب ہمارا مطالبہ پورا ہو گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ خدا ضرور پورا کرے گا۔ "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۳۴۔ دیدار نیک بندے کا

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں اس قید خانے میں مقیم رہا۔ قیام کرتے کرتے مجھے یہ معلوم نہیں ہوا کہ آخر یہ قبر کس کی ہے یہاں پر کس بزرگ کو یا کس شخص کو دفن کیا گیا ہے کچھ معلوم نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے قیاس آرائی کی کہ چاند بی بی کی ہوسکتی۔ قبر کے قلعہ سے باہر ایک پہاڑی واقعہ ہے۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ بحر حال کسی کی بھی ہو، کوئی خاص شخصیت ہوگی۔ ساتھ قلعہ کے تمام عمارت گرائی گیں تھیں لیکن اس قبر کو محفوظ رکھا گیا ہے۔ اور اس قبر کا احترام تا ابد موجود ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ قبر پرانی بھی ہے لیکن ویرانی کی حالت میں نہیں ہے۔ اگر چہ اس قبر پر کوئی غلط ہاتھ اٹھاتا تو بہت ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ اگر انگریزی حکمرانوں کی تعمیل عوام پر ردعمل ہے۔ اس قبر کا احترام انگریزی حکمرانوں کے زیر اہتمام بھی ہوا ہے۔ اس کا مطلب نیک آدمیوں پر نیک شخصیتوں پر کوئی بھی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ خیر اس وقت ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے خیالات ایک ہیں ہمارے خیالات دوسرے ہیں۔ دونوں خیالات مل نہیں سکتے۔ ہمارے ملک کی اکثریت یہی کہتی ہے کہ ہم "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۳۵۔حال سے بحال رہا معلوم ہے مجھ کو

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب مجھے قید میں رکھا گیا۔تو مغربی رُخ کے تمام کمرے کھلے اور ہوا سے بھرپور تھے۔لیکن ان کمروں میں مولانا صاحب کیلئے پہلا کمرہ حصے میں آیا۔مولانا صاحب نے کمرے میں قدم رکھا اور کمرے میں بیٹھ کر چارپائی حاصل کی ۔میں بہت تھکا ہوا تھا نو مہینے کی نیند اور تھکن میرے ساتھ بستر پر گری۔ مطلب نو مہینے جیل میں گزارے اور جیل میں قیام کرتے کرتے کوئی بھی آرام نہیں کیا۔نئے سرے سے پھر قید کیا گیا جس کی وجہ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمیشہ ملک کی سربراہی سے کتنی تعزیتیں مجھے ملی۔اگرچہ آرام بھی قسمت میں نہیں ہے لیکن میرے اس دُکھ سے لوگ سکھ بھی دیکھ سکتے ہیں اور میرے لئے یہ ایک ثواب ہے جبکہ میں لوگوں کو ایک اپنی طرز کی حکومت عطا کروں گا۔آئندہ کے نسل مجھے ہمیشہ یاد کرے گی پورا یقین ہے اللہ تعالیٰ میری خواہش کو پورا کر کے رہے گا اور ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

۳۶۔آرام میرے قسمت میں ہے ہی نہیں

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب ۹ بجے سویا اور صبح کو آنکھ کھولی مطلب تین بجے اٹھا اور تازہ خیالات دماغ میں آنے لگے۔نہ سر میں درد تھا اور نہ ہی بدن میں درد محسوس کیا۔فوراً بجلی جلائی اور چائے کا پیالہ پیا۔اس چائے کو میں جام کے برابر تصور کرتا ہوں اور اپنی قلم سے داستان بے ستون کوہ کن یعنی ایسی داستان جس میں بہت سے غم تحریر کرر ہا ہوں۔کوہ کا مطلب پہاڑ، کن کا مطلب ہے پہاڑ کی چوٹی اسی کو کوہِ کن کہتے ہیں۔میرے خیال میں مولانا صاحب فرما رہے ہیں کہ ایک رہنما کو جب لوگوں کی رہنمائی کرنی ہو تو اس رہنما کو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے آرام کرنا لازمی

رہے۔ مانتے ہیں کہ لوگوں کی پریشانی کے سبب خود رہنما پریشان ہوگئے۔ لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ خدا ایسا آرام ضرور دلائے گا جس کے بعد ہم عوام کی رہنمائی کرینگے۔ ہماری قوم کو آزادی ملنی چاہیئے اور انگریزی حکمران کو اس ملک سے بسترہ گول کرنا چاہیئے۔ اس وقت آرام وسکون ضرور آئے گا۔ ویسے اس کے بعد بھی اور لوگوں کو مشکلات حل کرنے کے لئے سکون محسوس نہیں ہوگا۔ پھر ایک بڑا بھاری قلعہ کو فتح کرنے کیلئے آرام کرنا ہوگا۔ خدا پر بھروسہ رکھ کر کہہ رہا ہوں "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۳۷۔ جاگوں جگاؤں قوم کو

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جب انہیں چارپائی قید خانے میں حاصل ہوئی تو چارپائی پر بیٹھ کر تقریباً تین بجے سے چھ بجے تک سوتے رہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے نو بجے تکیہ پر اپنا سر رکھا اور صبح کو آنکھ کھولی۔ اس کا مطلب یہ ہوا سر تکیہ پر اس لئے رکھا کہ ان کے دل میں قوم کے لئے درد ہمیشہ رہا۔ اور اسی درد کے خاتمے کے لئے اپنا سر تکیہ پر رکھ کر سو گئے اور یہ سوچنے لگے کہ ضرور "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۳۸۔ شاعری سے رہا متاثر دوستوں

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ میں ہمیشہ شاعروں کے شعر سے متاثر رہے۔ مجھے اس بات سے تسلی رہی کہ میں لوگوں کا ہمیشہ خادم رہا اور یہ خدمت تب پوری ہوسکتی ہے جب میری خواہش اس طرح پوری ہوجائے۔ میں ہمیشہ کہتا ہوں۔ "آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور"۔

۳۹۔ مطلب ردیف اور کافیہ کا

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ غزل ہو یا نظم دونوں کا ردیف بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ جب میں چائے کا پیالہ پی رہا تھا، اس وقت مجھے خیال آیا کہ کسی شعر کا مطلب دہراتا ہوں۔ مذہب اسلام میں اُصُل ہوتے ہیں اور مسلمان ہونے کے ناطے مجھے اپنے مذہبی اصولوں پر قائم ودائم رہنا ہے۔ کافر شرک کر رہا ہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے مجھے کافر کے ساتھ سمجھوتہ ہی نہیں رکھنا ہے اور کافر کو سمجھانے کا حق بھی ہے تاکہ اسے یہ کہا جائے کہ آپ غلطی پر ہیں۔ میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا اور نہ جھوٹ پر اعتقاد رکھتا ہوں کیونکہ مجھے کافر کے اصولوں کو ترک کرنا ہے اور اسلام کے اصولوں کو مؤثر انداز سے روشناس کرنا ہے۔ خود بھی اصولوں پر چلنا ہے اور دوسرے کو بھی اس پر چلنا لازمی ٹھہرانا ہے۔ میرے خیال میں مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے ناطے میں قوم کو کوئی بھی غلط کام نہیں کرنے دوں گا۔ اگرچہ میں قوم کی رہنمائی کرتا ہوں تو مجھے کافر کے اصول عوام کے سامنے نہیں رکھنے ہیں۔ مجھے لوگوں کے لئے مطالبات کے مطابق کام انجام دینے ہیں۔ اسی لئے انگریز اپنی حکومت میں کافروں جیسے کام انجام دے رہے ہیں۔ اس کفر کو مٹانے کے بعد مجھے پورا یقین ہے کہ خدا میری اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں میری مدد کریگا کہ ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔

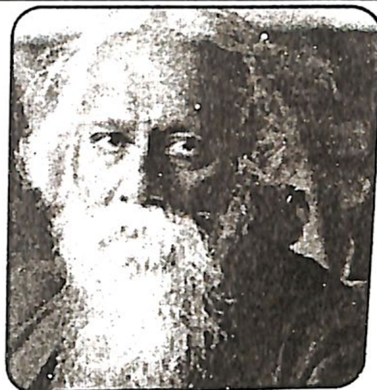
۴۰۔ خط سمجھو یا خط وکتابت کا افسانہ

مولانا صاحب فرما رہے ہیں کہ چٹھی ارسال کر رہا ہوں۔ اس چٹھی میں جو کوئی بھی واقعہ درج کیا وہ صحیح ہے اور پڑھ کر کیا محسوس کرو گے وہ خدا کو معلوم ہے۔ بہر حال میں نے یہ خط پوری غور وفکر کے ساتھ اپنی قلم سے لکھا ہے۔ اس خط کو افسانہ یا شاعری

سمجھو گے بہر حال اس میں صداقت ہی صداقت ہے۔ یہ خط ایسا بھی محسوس ہو سکتا ہے جیسے کہ مرزا غالب نے ذوق کی خامیاں فرسا کو ستم زدگی سے تعبیر کیا تھا۔

مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

میرے خیال میں مولانا صاحب اس خط میں جو بھی لکھ رہے ہیں وہ اشارہ آزادی کے بارے میں تحویل کرر ہا ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا کہ انگریزی حکومت ہونے کے باعث خط و کتابت میں صحیح باتیں نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ انگریزی حکمران اپنی حکومت کے دوران خط و کتابت پر جانچ پڑتال بھی کرتے تھے۔ اسی لئے میرے خیال میں مولانا صاحب نے اس خط میں اشارے دیئے ہیں تشبیہ نہیں۔ وہ انہی کو سمجھ آ سکتا جن کے نام خط لکھیں ہے۔ لیکن مولانا صاحب کا یہی خواہش اور ولولہ رہا کہ ''آزاد ہند آزاد رہے ضرور انگریز حکمران نہیں منظور''۔



ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور کا افسانہ

''جوگن''

ترجمہ: راجہ مہدی علی خان

اُردو ادب میں ادبی تنقید کے لحاظ سے

آج سے کچھ مدت پہلے کا ذکر ہے۔ کہ میری تحریروں نے عوام کو میرے برخلاف کردیا۔ جب اخبارات ورسائل نے شدید نکتہ چینی کیلئے بھی مجھی کو منتخب کرلیا۔ تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کسی پرسکون اور اجنبی مقام پر چلا جاؤں اور کوشش کروں کہ عوام تو کجا خود اپنے آپ کو بھی کچھ عرصے کیلئے یکسر فراموش کردینے کا موقع دوں۔

کلکتہ کے نواح میں میرا ایک گاؤں ہے۔ جہاں میں دنیا والوں کا ہدف ملامت بننے سے بچ کر رہ سکتا ہوں۔ گاؤں والوں نے فی الحال میرے متعلق کوئی قطعی رائے

قائم نہیں کی۔ وہ جانتے ہیں کہ گاؤں میں رہنے سے میرا مقصد محض عیش وعشرت نہیں ہوتا کیونکہ میں نے اپنے گاؤں کو شہر میں بسنے والوں کے شور وشغف سے کبھی برہم نہیں کیا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں ایک تارک الدنیا نہیں۔ انہیں میرے قرب میں آرام وآسائش کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔ انہیں مجھ پر سیاح کا دھوکا بھی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگر چہ میں فطرتاً آوارہ گرد واقع ہوا ہوں۔ لیکن میرا کام صرف گاؤں کے کھیتوں کے اردگرد چکر لگانا ہوتا ہے۔

گاؤں والوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میری شادی ہوچکی ہے یا نہیں کیونکہ انہوں نے کبھی مجھے اپنے بچوں کے ساتھ نہیں دیکھا۔ میں انکے لئے ایک ایسا معمار ہوں جو حل نہ ہوسکے۔ ایک مدت سے انہوں نے میرے متعلق کچھ سوچنا یا میرے متعلق کوئی رائے قائم کرنا ترک کر رکھا ہے۔

لیکن تھوڑے ہی دن ہوئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ گاؤں میں کم سے کم ایک شخص ایسا بھی ہے جسے مجھ سے انتہائی دلچسپی ہے۔ اس سے میری پہلی ملاقات موسم گرما کی ایک سہ پہر کو ہوئی۔ صبح سے بارش ہورہی تھی اور اس وقت کہرے نے فضا کو نم آلود اور بوجھل بنا رکھا تھا۔

میں ایک چتکبری گائے کی طرف جو دریا کے کنارے چر رہی تھی، دیکھ رہا تھا۔ اس کے چمکیلے جسم کو سورج کی شعاعیں چوم رہی تھیں۔ گائے کے قدرتی لباس کی طرف دیکھ دیکھ کر میرے دل میں عجیب وغریب خیالات پیدا ہورہے تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اپنے جسم کو قدرتی لباس سے محروم کر کے کپڑے مہیا کرنے میں کس قدر اسراف سے کام لیتا ہے۔

میں اس قسم کے خیالات میں غرق بیٹھا تھا۔ کہ ادھیڑ عمر کی ایک عورت میرے سامنے آکر جھک گئی اور میرے دیکھتے دیکھتے اس نے مجھے سجدہ کر دیا۔ اس کی جھولی

میں کچھ پھول تھے۔ جن میں سے اس نے میرے ہاتھوں میں کچھ دے دیئے اور پھر نہایت ادب کے ساتھ دست بستہ کھڑی ہوگئی۔ پھول پیش کرتے وقت اس نے مجھ سے جو الفاظ کہے وہ یہ تھے۔

"یہ ناچیز ہدیہ اپنے معبود کی خدمت میں پیش کرتی ہوں"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ لیکن اس کے الفاظ نے میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل مچادی۔ میں اس قدر گھبرا گیا کہ اس کے لوٹنے سے قبل میں اس کے چہرے پر ایک نگاہ بھی نہ ڈال سکا۔ اگرچہ یہ واقعہ بظاہر مجھے بالکل معمولی معلوم ہوتا تھا مگر میرے دل پر اس نے گہرا اثر کیا تھا۔ وہ چلی گئی تھی اور اب صرف وہ گائے میرے سامنے تھی جسے میں دیکھ رہا تھا۔ اور جو گھاس چرنے میں مصروف تھی، مجھے اس گائے کا وجود بھی پر اسرار معلوم ہونے لگا۔ شاید آپ مجھ پر ہنسیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت میرا دل خدا کی تعریف کے جذبات سے لبریز ہوگیا۔ مجھے زندگی کی مقدس مسرتوں کا ہدیہ پیش کیا گیا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہی ہر قسم کی زندگی کا سر چشمہ ہے۔ پھر میں نے آم کے درخت کی ایک نازک سی ڈالی توڑ کر گائے کو کھلائی۔ اس سے میری روح کو کچھ تسکین سی ہوئی اور مجھے یوں معلوم ہونے لگا۔ جیسے میں نے گائے کو نہیں۔ بلکہ اپنے خدا کو خوش کیا ہے۔

دوسرے سال میں فروری کے مہینے میں اپنے گاؤں پہنچا۔ جاڑے نے ابھی الوداع نہیں کہی تھی۔ ایک صبح میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ دھوپ میرے کمرے میں داخل ہورہی تھی۔ جس کی خوشگوار گرمی نے میرے دل میں خدا کے لئے جذبات تشکر پیدا کر رکھے تھے۔ مَیں لکھنے میں مصروف تھا کہ میرے خدمتگار نے مجھے اطلاع دی کہ ایک جوگن ملاقات کے لئے نیچے کھڑی ہے۔ میں نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا "کہ اسے اوپر بلالاؤ" اور از سر نو لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد جوگن میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس نے میرے قدموں کو چھوا اور میرے سامنے جھک گئی۔ میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی عورت ہے جو گزشتہ سال چند لمحوں کے لئے مجھ سے ملی تھی۔

اب میں نے نگاہ بھر کر اسے دیکھا۔ اس کی عمر اس حد سے بڑھ چکی تھی جس حد پر کسی عورت کے حسن پر بحث کرنے کی ضرورت سمجھی جائے۔ وہ سرو قد تھی اور اس کا جسم بہت مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ لیکن کثرتِ عبادت نے اس کی کمر میں ایک ہلکا سا خم پیدا کر دیا تھا۔ اس کی حرکات میں کسی قسم کی جھجک نہ تھی۔ اس کے چہرے کا سب سے نمایاں حصہ اس کی خوبصورت آنکھیں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس شئے کی طرف وہ دیکھتی ہے۔ اس شئے میں اس کی نگاہیں کھپ جاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی زبردست قوت ادراک تھی۔ جس کا اندازہ انسان کی قوت فکر سے نہیں کر سکتیں۔

جب وہ اندر داخل ہوئی تو مجھے یوں معلوم ہوا۔ جیسے اس نے اپنی ان دو خوبصورت آنکھوں سے میرے جسم کو ایک دھکا سا دیا ہے۔ آخر وہ کہنے لگی۔

''میرے معبود! مجھے تو نے اپنے تخت کے پاس کیوں بلا لیا۔ میں تجھے درختوں کے سائے میں بیٹھے دیکھا کرتی تھی۔ تجھ سے ملاقات کرنے یا تجھے دیکھنے کی اصل جگہ تو وہی ہے۔ میں تجھے وہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

شاید اس نے مجھے باغ میں ٹہلتے دیکھ لیا تھا۔ لیکن چونکہ گزشتہ چند دن سے مجھے نزلے کی شکایت تھی۔ اس لئے میں ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جوگن نے کہا۔ ''اے میرے معبود مجھے نیکی کی راہ بتا۔''

میرے لئے یہ سوال بالکل ناگہانی اور غیر متوقع تھا۔ چنانچہ میں نے بلا تامل جواب دیا کہ ''نیکی کا درس نہ میں نے کبھی لیا ہے۔ اور نہ دیا ہے میں اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں اور میرے لبوں پر مہر سکوت لگی رہتی ہے۔ اس طرح میں دیکھ بھی سکتا ہوں

اور سن بھی سکتا ہوں ۔ خواہ کوئی آواز پیدا ہو یا نہ ہو۔ اس وقت میں تمہیں دیکھ کیا رہا ہوں۔سن رہا ہوں۔"

میں نے کہا "میں خاموشی کی حالت میں اپنے تمام جسم سے سن سکتا ہوں اور میں صرف یہی آواز سننے کلکتے سے یہاں آیا ہوں۔

جوگن بولی۔ "یہ بات مجھے معلوم ہے اور اسی لئے میں تیرے حضور میں پہنچی ہوں۔ جانے سے پہلے اس نے پھر جھک کر میرے قدموں کو چھوا۔ اور میرے پیروں میں جرابیں دیکھ کر اسے کچھ تکلیف سی ہوئی۔ کیونکہ وہ میرے ننگے پیروں کو چھونا چاہتی تھی۔

دوسرے دن صبح صبح ہی میں اپنے بالا خانے کی چھت پر آ بیٹھا۔ جنوب کی طرف درختوں کی قطاروں کے پار مجھے اجاڑ اور سر سبز وسیع میدان نظر آ رہا تھا اور مشرق میں دور، بہت دور ایکھ کے کھیتوں پر سے سورج طلوع ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گھنے درختوں کے جھنڈوں میں گاؤں کی سڑک دکھائی دے رہی تھی جو دوسرے قصبات کی طرف جاتی تھی اور دور پہنچ کر دھند میں غائب ہو جاتی تھی۔

اس صبح یہ کہنا مشکل تھا کہ سورج طلوع ہو چکا ہے کیونکہ ہر طرف دھند ہی دھند نظر آتی تھی اور درختوں کی چوٹیوں سے ابھی تک پالا چمٹا ہوا تھا۔

صبح کے دھندلکے میں میں نے اپنے سامنے جوگن کو جاتے دیکھا۔ وہ خدا کی تعریف میں گیت گاتی سنکھ بجاتی پھر رہی تھی۔

کہرا رفتہ رفتہ غائب ہونے لگا اور سورج کی تیز روشنی ہر طرف پھیل گئی۔

میں اپنے حریص ایڈیٹر کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے کمرے میں بیٹھا مضمون لکھ رہا تھا کہ مجھے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ایک ہی لمحے کے بعد میں نے دیکھا کہ جوگن آہستہ آہستہ کوئی گیت گنگناتی آ رہی ہے۔ وہ میرے کمرے میں آ کر میرے سامنے ادب سے جھک کر کھڑی ہو گئی۔

جب میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو وہ کہنے لگی ۔میرے معبود کل میں تیرے دستر خوان سے کچھ بچا کھچا کھانا بطور تبرک لے گئی تھی۔

میں یہ سن کر چونک اٹھا۔اور اس سے پوچھا کہ ''تم نے اسے حاصل کس طرح کیا؟''

اس نے کہا کہ ''میں دروازے پر بہت دیر تک منتظر کھڑی رہی اور جب ملازم کھانے کے برتن باہر لایا تو طشتری میں سے کچھ کھانا میں نے لے لیا۔

مجھے اس کا بیان سن کر بہت تعجب ہوا گاؤں کے سب لوگ جانتے تھے کہ میں یوروپ جاکر فرنگیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھا چکا ہوں۔اس لئے مذہب کے پجاری میرے کھانے کو ناپاک سمجھتے تھے۔

میرے چہرے پر تعجب کے آثار دیکھ کر جوگن کہنے لگی۔میرے معبود! اگر میں تیرا کھانا اپنے لئے ناجائز سمجھوں۔تو بھلا پھر تیرے پاس کس لئے آؤں۔

میں نے کہا۔یہ ٹھیک ہے مگر لوگ کیا کہیں گے؟''

وہ بولی۔ ''میں پہلے ہی سب لوگوں کو بتا چکی ہوں۔میری باتیں سن کر وہ اظہار تاسف کر کے اپنے سر ہلا چکے ہیں اور کہہ چکے ہیں کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

مجھے معلوم ہوا کہ یہ جوگن ایک نہایت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔اس کی خوشحال ماں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔مگر اس نے جوگن بننے کو ترجیح دی۔اس نے مجھے بتایا کہ دردر کی بھیک مانگ کر جو روزی مجھے ملتی ہے۔میں اسی کو مقدس سمجھتی ہوں ۔میں کچھ عرصہ اس کی بات پر غور کرنے کے بعد اس کے مدعا کو فوراً سمجھ گیا۔ جب ہمیں روزی خیرات کی صورت میں ملتی ہو۔تو ہم خدا ہی کو اپنا داتا سمجھتے ہیں اور اس کے زیادہ شکر گزار ہوتے ہیں لیکن جب ہمیں گھر پر معمول کے مطابق کھانا ملتا رہے۔تو اسے اپنا حق تصور کرنے لگتے ہیں۔

میری خواہش تھی کہ اس کے شوہر کے متعلق اس سے کچھ پوچھوں لیکن جب

نے خود کبھی اس کا ذکر نہ کیا تھا۔ اس لئے میں نے اس سلسلے میں اس سے کوئی سوال پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس جوگن کے دل میں گاؤں کے متمول لوگوں کی ذرہ بھر بھی وقعت نہیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ خدا کی راہ میں ایک پائی تک خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود خدا نے انہیں دولت اور مسرت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ان کے مقابلے میں غریب فاقہ کشی کرتے اور بھوکے مرتے ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا کہ تم ان گمراہ لوگوں میں جا کر کیوں نہیں رہتیں تاکہ وہ سیدھی راہ پر چل سکیں۔ یہ بھی تو خدا کی عبادت کی ایک بہترین صورت ہے۔ "لیکن جوگن کے دل پر میری اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔" کہ میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ یعنی چونکہ خدا گنہگاروں کی سرپرستی کرتا ہے۔ اس لئے جب ہم ان کی خدمت کرتے ہیں۔ تو دراصل خدا کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

میں نے کہا "ہاں میری بات کا یہی مطلب ہے۔"

اس نے بے صبری سے جوابدیا۔ "بیشک خدا ان کے ساتھ ہے۔ ورنہ وہ کبھی عیش و عشرت کی زندگی نہ بسر کر سکیں۔ مجھے ان سے کیا مطلب! میرا خدا ان کے ساتھ نہیں ہے۔ میں وہاں رہ کر خدا کی عبادت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ میرا خدا ان میں نہیں ہے۔ میں اپنے خدا کو اس جگہ ڈھونڈتی ہوں۔ جہاں وہ موجود ہے۔"

جب اس نے مجھ سے یہ کہا۔ اس کی گردن میرے سامنے فرطِ احترام سے جھک گئی تھی۔ اس کی باتوں کا غالباً یہ مطلب تھا کہ خدا کے ہر جگہ موجود ہونے کا نظریہ غلط ہے اور ہمیں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاید مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جوگن مجھے ایک انسان سمجھ کر میری پرستش

کرتی تھی۔ نہیں بلکہ اس نے میرے وجود کو خدا کی عبادت کا ایک وسیلہ سمجھ لیا تھا۔ مجھے اس کی اس عبادت کے ردو قبول کا کوئی اختیار نہ تھا۔ کیونکہ وہ میری عبادت نہیں بلکہ خدا کی عبادت کرتی تھی۔

دوسری مرتبہ جب وہ آئی۔ تو اس نے پھر مجھے کتابوں اور کاغذوں کے انبار میں گھرا ہوا دیکھا اور تنگ آکر بولی۔ ''میرے معبود! یہ کیا مصیبت ہے میں جب آتی ہوں۔ تجھے مطالعہ میں مصروف دیکھتی ہوں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''خدا اپنی ناکارہ اور حقیر مخلوق کو ہر وقت مصروف رکھتا ہے۔ تاکہ وہ فتنہ وفساد برپا کرنے سے بچی رہے۔''

جوگن کہنے لگی ''میرے معبود! تو نے میری راہ میں بہت سے کانٹے بو رکھے ہیں۔ میں ان کی تاب نہیں لاسکتی۔ اگر میں تیرے پاس آنا چاہوں تو تیرے نوکر مجھے روک لیتے ہیں۔ اگر میں تیرے پاؤں چھونا چاہوں تو جرابیں حائل ہوتی ہیں اور جب میں تجھ سے سیدھی سادی باتیں کرنا چاہوں۔ تو تیرا دماغ مجھے لفظوں کے وسیع وعریض صحرا میں راستہ بھولا ہوا معلوم ہوتا ہے۔''

جب وہ مجھ سے رخصت ہونے لگی تو بولی ''میرے معبود! آج صبح جب میں نے تیرے پاؤں اپنے سینے میں محسوس کیئے۔ تو اُف، وہ کس قدر سرد تھے۔ جرابوں نے انہیں میری نظروں سے چھپا نہیں رکھا تھا۔ میں انہیں اپنے سر سے لگا کر دیر تک تیری عبادت میں مصروف رہی۔ پھر میرے آقا تو بتا کہ اب میں تیرے پاس کیوں آگئی ہوں؟ میرے پھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میرے آقا! سچ سچ بتا کہ میں پھر کیوں آگئی تیرے پاس؟ کیا یہ ایک جنون نہیں؟

اسی اثناء میں میرے گلدان کے مرجھائے ہوئے پھولوں کی جگہ تازہ پھول لگانے کے لئے جب مالی آیا اور اس نے مرجھائے ہوئے پھولوں کو پھینک دینا چاہا۔

تو وہ زور سے چلا کر کہنے لگی۔ ''کیا اب یہ پھول بیکار ہو گئے ہیں لاؤ لاؤ! انہیں میں لے لوں گی۔''

پھر اس نے نہایت نرمی سے ان پھولوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور نہایت احترام سے سر جھکا کر انہیں دیکھنے لگی۔

پھر اس نے اپنی نگاہ میری طرف اٹھا کر کہا۔ ''تم ان پھولوں کو غور سے نہیں دیکھتے۔ اگر تم انہیں ذرا بھی غور سے دیکھتے تو یہ سب لکھنا پڑھنا بھلا بیٹھتے۔''

اس نے اس گلدستے کو نہایت احتیاط کے ساتھ اپنے آنچل میں باندھ لیا اور اس آنچل کو نہایت احترام کے ساتھ اپنے سر پر رکھ کر کہنے لگی۔ ''اب میں اپنے معبود کو اپنے ساتھ ساتھ لئے پھروں گی۔''

اس کی یہ روش دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے کمرے کے گلدانوں میں جو پھول پڑے رہتے ہیں۔ ہم ان پر ایک ایسی محبت آمیز توجہ صرف نہیں کرتے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں اور بیچارے پھول اس طرح پڑے رہتے ہیں جیسے مدرسے کے وہ شریر بچے جنہیں سزا دینے کے لئے ایک قطار میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔

اسی شام کو جوگن پھر میرے اوپر کے کمرے میں آئی اور آ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔

پھر کچھ سوچ کر بولی ''جب میں اپنے معبود کی تعریف میں گاتی ہوں۔ در در پھر رہی تھی تو میں نے وہ تمام پھول لوگوں میں بانٹ دیئے۔ ہمارے گاؤں کا نمبردار میرے اس اظہار عقیدت پر ہنسنے لگا اور بولا۔ تم کیوں اس کی اس قدر پرستش کرتی ہو۔ تمہارا یہ فعل بے سود اور بے کار ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ وہ بہت بدنام ہے اور لوگ ہر وقت اس پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ میرے معبود! کیا یہ سچ ہے؟ کیا واقعی لوگ تجھ سے بے رخی کے ساتھ پیش آتے ہیں؟''

ایک لمحہ کے لئے میں مبہوت رہ گیا۔ میرے لئے یہ انکشاف بالکل نیا تھا کہ مطبع والوں کی روشنائی کے دھبے واقعی اتنی دور دور تک پہنچ چکے ہیں؟

جوگن نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا اور کہا کہ گاؤں کا نمبردار سمجھتا تھا کہ وہ میری پرستش کے شعلے کو اپنی ایک ہی پھونک سے گل کر دے گا۔ لیکن وہ کیا جانے کہ یہ ایک چھوٹا سا شعلہ نہیں بلکہ بھڑکی ہوئی آگ ہے میرے معبود! مجھے بتا کہ لوگ تجھے کیوں برا جانتے ہیں؟

میں نے جواب دیا۔ "اس لئے کہ میں اسی قابل ہوں۔ شاید میری حرص اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں نے چوری چوری لوگوں کے دل مٹھی میں لینے چاہے۔

جوگن بولی۔ معبود! اب تو نے دیکھ لیا کہ ان لوگوں کے دل کس قدر حقیر اور ناکارہ شئے ہیں۔ ان میں زہر بھرا ہوا ہے لیکن یہی زہراب تجھے اس حرص سے نجات دلا دے گا۔

میں نے جواب دیا۔ جس شخص کے دل میں حرص ہو اسے ہر وقت اپنے سزا پانے کا خطرہ رہتا ہے اور یہ حرص خود دشمنوں کے لئے زہر فراہم کرتی ہے۔

اس نے کہا " ہمارا مہربان خالق خود ہمیں سزا دیتا ہے اور زہر کے اثرات سے ہمارے دلوں کو بچائے رکھتا ہے۔ جو شخص آخری دم تک خدا کی مرضی پر چلتا رہے۔ وہ ضرور نجات کی راہ ڈھونڈ لیتا ہے۔"

اسی شام کو جوگن نے مجھے اپنی زندگی کی دکھ بھری داستان سنائی۔ شام کے ستارے طلوع ہو کر درختوں کی اوٹ میں غروب ہو چکے تھے۔

لیکن وہ اپنی داستان بیان کرتی چلی گئی۔

کہنے لگی "میرا شوہر بہت سادہ مزاج ہے۔ بعض لوگ اسے سادہ لوح خیال کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جو لوگ ہر بات کو سادہ طریقے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہی صحیح راہ پر ہیں۔

میرا شوہر اپنے کاروبار اور گھر کے انتظام میں کافی سلیقہ رکھتا تھا اس کی ضروریات محدود اور خواہشات کم تھیں۔ اس لئے وہ اپنے بڑے بڑے فرائض کو نہایت اچھی طرح سے انجام دے لیتا تھا۔ دوسری باتوں میں نہ وہ دخل دیتا تھا اور نہ انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔

ہماری شادی کے تھوڑے ہی عرصے بعد میرے شوہر کے والدین کا انتقال ہوگیا اور ہم دونوں تنہا رہ گئے۔ میرے شوہر میں حکومت کی بجائے اطاعت کا جذبہ زیادہ تھا۔ وہ ہمیشہ کسی دوسرے کا مطیع ہوکر رہنا چاہتا تھا اور مجھے اس بات کا اقرار کرتے ہوئے شرم محسوس کرنی چاہئے کہ وہ مجھے نہایت احترام کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اپنے مقابلے میں مجھے بہت ارفع واعلیٰ تصور کرتا تھا، لیکن مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ اگرچہ باتیں کرنے میں مجھے اس سے زیادہ مہارت حاصل تھی۔ مگر معاملات کی تہ تک پہنچ جانا بس اسی پر ختم تھا۔

اس کے دل میں اپنے گروٹھاکر کے لئے بے انتہا محبت موجود تھی۔ اس کے دل میں اس کے لئے صرف خلوص ہی نہیں تھا بلکہ محبت بھی تھی۔ ایسی محبت جس کی مثال دنیا پیش نہ کرسکے۔

گروٹھاکر عمر میں میرے شوہر سے بہت چھوٹا تھا اور وہ کس قدر حسین تھا؟ یہ میں بیان ہی نہیں کرسکتی۔ میرا شوہر بچپن میں اس سے کھیلتا رہا اور اس کے دل ودماغ پر ہر وقت وہی مسلط رہتا تھا۔ ٹھاکر میرے شوہر کی اس سادہ دلی کو خوب جانتا تھا۔ وہ اسے خوب دِق کیا کرتا اور وہ اس کے ساتھ مل کر میرے شوہر کا مضحکہ اڑایا کرتے لیکن وہ اس کی حرکتوں کی مطلق پروانہ کرتا۔

جب میں پندرہ سال کی ہوئی تو خدا نے مجھے ایک بچہ دیا۔ میری عمر اتنی کم تھی کہ مجھے اس کی پرورش اور نگہداشت کرنے کے متعلق کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مجھے بچے کو

پیار کرنے کے بجائے ...... باتیں کرنے کا زیادہ شوق تھا۔ میں گھنٹوں گاؤں میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ باتیں کرتی رہتی اور اگر کبھی مجھے بچے کے خاطر گھر رہنا پڑتا تو میں سخت برہم ہوجاتی۔ آہ میرا ننھا دیوتا میرے پاس آیا لیکن میں نے اس کے لئے کھلونے تیار نہ رکھے۔ وہ ماں کی آغوش میں آیا لیکن ماں نے اسے اپنی آغوش میں جگہ نہ دی۔ آخر وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے ناراض ہوکر چلا گیا اور اب میں نے اس کی تلاش میں دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ لیکن اسے کہیں نہیں پاسکی۔

بچہ اپنے باپ کی آنکھوں کا نور تھا۔ میری بے پروائی اور عدم توجہی پر میرے شوہر کا دل دکھتا تھا۔ لیکن خدا نے اس بچارے کو بے زبان بنایا تھا۔ اس نے کبھی مجھ سے شکوہ نہ کیا، عجیب بات یہ ہے کہ میری بے توجہی اور بے التفاتی کے باوجود بچے کو مجھ سے زیادہ محبت تھی۔ اس کی گھبرائی ہوئی آنکھوں میں یہ خوف سما گیا تھا کہ کسی دن میں اسے چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ کیونکہ جب میں اس کے پاس بھی ہوتی وہ مجھے نہایت اضطراب انگیز نظروں سے دیکھا کرتا چونکہ میں اس کے پاس بہت کم رہتی تھی۔ اس لئے میرے پاس رہنے کی خواہش اس کے دل میں اور بھی زیادہ تھی۔ جب میں دریا پر نہانے جاتی تو وہ میری طرف دیکھ کر میرے ساتھ جانے کے لئے اپنی باہیں پھیلا دیتا۔ مگر نہانے کا گھاٹ تو وہ جگہ تھی کہ جہاں مجھے اپنی سہیلیوں سے ملنا ہوتا تھا۔ میں وہاں اپنے آپ پر بچے کا بوجھ لاد کر نہیں جانا چاہتی تھی۔

اگست کی ایک صبح کا ذکر ہے کہ میں نے بچے کو نوکرانی کے سپرد کیا اور خود دریا کی راہ لی۔ میرے جانے پر بچہ زار زار رونے لگا۔ جب میں گھاٹ پر پہنچی تو وہاں میری کوئی سہیلی موجود نہیں تھی۔ مجھے تیرنے کا عشق گاؤں کی سب عورتوں سے زیادہ تھا۔ موسلادھار بارشوں کی وجہ سے دریا پانی سے بھرپور تھا۔ میں تیرتی ہوئی دریا کے درمیان جا پہنچی۔

یکایک مجھے کنارے پر کسی بچے کے پکارنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ تو میرا بچہ گھاٹ کی سیڑھیوں پر سے "اماں، اماں" پکارتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے چلا کر اس سے کہا "ارے ٹھہرو۔ آگے نہ آؤ۔ میں ابھی آتی ہوں" مگر اس نے میرا کہا نہ مانا بلکہ ہنستا اور مجھے پکارتا ہوا آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔ فرطِ دہشت سے میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ میری نگاہوں میں دنیا اندھیرا ہو گئی۔ خوف و ہراس کی شدت سے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن آہ جب دوبارہ میری آنکھیں کھلیں۔ تو گھاٹ کی ڈھلوان سیڑھیوں پر میرے بچے کے قہقہے ہمیشہ کے لئے کھو چکے تھے۔

میں کنارے پر پہنچی اور بچے کو پانی میں سے نکال کر اپنی گود میں لے لیا۔ وہ ہمیشہ میری گود میں آنے کیلئے میری منتیں کرتا رہتا تھا۔ اور اب اسے اپنی گود میں لئے ہوئے تھی۔ لیکن آہ، اب وہ میری آنکھوں سے آنکھیں ملا کر پہلے کی طرح مجھے "ماں" نہیں کہہ سکتا تھا۔

میرا بچہ...... میرا دیوتا میرے پاس آیا۔ مگر میں نے اس کی پروانہ کی۔ میں ہمیشہ اپنے دیوتا کو رُلاتی رہی اور جب وہ مجھ سے کھو گیا۔ تب مجھے اپنی بیدردی کا احساس ہوا اور میرے دل نے اس کے لئے رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ غم محسوس کرنا شروع کیا۔ جب وہ میرے پاس ہوتا تھا تو میں اسے تنہا چھوڑ جاتی تھی اسے اپنے ساتھ نہ لے جاتی تھی۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کی یاد ہر وقت میرے دل میں رہتی ہے اور میں اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑتی۔

ظاہر ہے کہ اس حادثہ کا کس قدر صدمہ میرے شوہر نے محسوس کیا ہوگا۔ کاش! وہ مجھے میرے اس جرم کی سزا دے دیتا۔ یہ بات ہم دونوں کے لئے بہتر ہوتی۔ لیکن وہ ہر بڑی سے بڑی مصیبت کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اس کے

منہ سے میں نے کبھی کوئی درشت کلمہ نہ سنا۔

جن دنوں میں رنج وغم سے دیوانی ہو رہی تھی ۔ گروٹھا کر بنارس سے واپس آیا۔ شروع شروع میں تو میرے شوہر اور گروٹھا کر کے تعلقات محض طفلانہ دوستی تک محدود تھے۔ لیکن اب اس کا علم وفضل اور روشن ضمیری دیکھ کر میرے شوہر کے دل میں اس کے لئے بہت احترام پیدا ہو گیا۔ اور اب تو اس کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ گروٹھا کر سے آزادانہ بات چیت کرتے ہوئے بھی ہچکچانے لگا۔

میرے شوہر نے گروٹھا کر سے درخواست کی کہ وہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کرے۔ چنانچہ گروٹھا کر مجھے مقدس کتابیں پڑھانے لگا۔ اگرچہ وہ ہر بات کو تشریح کر کر کے پڑھاتا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں اس کی کسی بات کا میرے دل پر اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ الفاظ جو اس کی زبان سے نکلتے تھے۔ میرے دل پر کوئی اثر نہ کرتے تھے اور اگر میں ان الفاظ کی کچھ قدر کرتی تھی ۔ تو وہ محض اس آواز کی وجہ سے جو انہیں ادا کرتی تھی۔ خدا نے آسمانی شراب دلوں کی گہرائیوں میں چھپا کر رکھی ہے اور ہم اسے انسانی آواز کے ذریعے پیتے ہیں۔

میرے شوہر کو گروٹھا کر سے جو محبت تھی اس کا اثر ہمارے گھر کے ذرے ذرے پر تھا۔ میرے دل میں بھی اس کے لئے عقیدت پیدا ہو چکی تھی اور اب میں مطمئن تھی۔ یعنی میں نے اپنے خدا کو اس گرو کی صورت میں دیکھ لیا۔

وہ ہر صبح ناشتہ کرنے ہمارے ہی گھر آتا۔ جونہی صبح میری آنکھ کھلتی میرے دل میں سب سے پہلے یہ خیال آتا کہ مجھے اس کے لئے ناشتہ تیار کرنا ہے۔ میں اسے خدائے قدوس کا ایک بھیجا ہوا انعام تصور کرتی تھی۔ جب میں اس کے لئے کھانا تیار کرنے لگتی۔ تو میرے ہاتھوں کی انگلیاں مسرت سے کانپنے لگتیں۔

جب میرے شوہر نے دیکھا کہ میرے دل میں اس کے گرو کی اس قدر عزت اور

اس قدر احترام ہے۔ تو وہ پہلے سے بھی زیادہ میری قدر کرنے لگا اور جب وہ یہ دیکھتا کہ گرو اس قدر اشتیاق سے مجھے الہامی کتابیں پڑھاتا ہے۔ تو اس کا دل باغ باغ ہوجاتا اور دل میں سوچتا کہ میں نے اپنی نا اہلی کی وجہ سے گرو کے دل میں جو جگہ حاصل نہیں کی۔ وہ میری ذہین بیوی نے حاصل کر لی ہے۔

پانچ سال کا عرصہ اسی طرح نہایت مسرت سے کٹ گیا۔ میری زندگی کے باقی دن بھی اسی طرح بسر ہوجاتے لیکن میں انجان نہ جانتی تھی کہ کوئی پس پردہ مجھے چرا رہا ہے۔ میں اس چوری سے واقف نہ ہوسکی لیکن میرے دل کے خدا نے یہ چوری پکڑ لی۔ پھر میری زندگی کا وہ لمحہ بھی آ گیا جب کہ یکا یک میری زندگی کی بساط الٹ گئی۔

برسات کی ایک صبح کو میں دریا سے نہا کر گھر واپس آ رہی تھی۔ میرا بھیگا ہوا لباس میرے جسم کے ساتھ چمٹ رہا تھا۔ سڑک کے موڑ پر، آم کے درختوں کے جھرمٹ میں مجھے اپنا گرو ٹھا کر ملا۔ وہ کندھے پر اپنا تولیہ لٹکائے ہوئے سنسکرت کا ایک شبد گاتا ہوا جا رہا تھا۔ میں گھبرا گئی۔ بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ اس کا سامنا کرنے کے خیال نے میرے دل میں تیز دھڑکن پیدا کر دی۔ میں نے نظر بچا کر جلدی سے وہاں سے گذر جانا چاہا لیکن اس نے میرا نام لے کر مجھے بلا لیا۔ میں حیا سے نگاہیں جھکا کر سمٹی سمٹائی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے نگاہ بھر کر دیکھا اور کہنے لگا۔ اُف تمہارا جسم کس قدر خوبصورت ہے۔

مجھے یوں معلوم ہوا۔ جیسے آم کے درختوں پر طیور خوش الحان نغمہ سنجی کرنے لگے ہیں اور آس پاس کی چھاڑیوں میں چمکیلے پھول کھل گئے ہیں۔ مجھے کائنات ایک کیف آفرین لذت میں ڈوبی ہوئی معلوم ہونے لگی۔

مجھے یاد نہیں کہ میں گھر کیوں پہنچی۔ صرف مجھے اتنا یاد ہے کہ گھر میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے میں نے عبادت کے کمرے کی راہ لی۔ لیکن کمرہ مجھے خالی خالی محسوس

ہوا۔ میری آنکھوں کو نور کی وہی چنگاریاں رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگیں جو آم کے درختوں کے جھنڈ میں لرزتی ہوئی دکھائی دی تھیں۔

اس دن جب گروٹھا کر ناشتے کے لئے آیا۔ تو میرے شوہر سے میرے متعلق دریافت کیا۔ میرے شوہر نے مجھے اِدھر اُدھر تلاش کیا۔ لیکن میں اسے کہیں نہ ملی۔

میرے لئے دنیا میں ایک انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ میں نے انتہائی مایوسی میں اپنے خدا کو پکارا لیکن اس نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ وہ دن میں نے کیسے گزارا۔ رات کو مجھے اپنے شوہر کے پاس جانا تھا۔ پر سکوت اور تاریک رات میں اس کا ذہن جلا پا کر چمکنے لگتا ہے اور اندھیرے میں اس کی گفتگو سن کر اکثر میں اس کی فہم اور عقل پر حیران ہو جایا کرتی تھی۔

بعض اوقات رات کو مجھے گھر کے کام کاج سے بہت دیر میں فرصت ملتی اور میرا شوہر بستر میں لیٹنے کے بجائے میرے انتظار میں فرش پر بیٹھا رہتا۔ اس موقع پر ہماری گفتگو کا موضوع اکثر گروٹھا کر ہوتا تھا۔

اس رات میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا۔ تو وقت کافی گزر چکا تھا۔ میرا شوہر فرش پر دراز تھا اور گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اس وقت اس کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور فرش پر اس کے قدموں کی طرف لیٹ گئی۔ میرے سر کا رخ میرے شوہر کے قدموں کی طرف تھا۔ ایک دفعہ اس نے سوتے میں اپنے پاؤں پھیلائے۔ تو وہ میرے سینے پر لگے اور یہ اس کا آخری تحفہ تھا۔ جو اس نے مجھے دیا۔

صبح اس کے بیدار ہونے سے پہلے میں اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ رات کے سیاہ دوپٹے پر شفق جگمگا رہی تھی۔

میں نے جھک کر اپنی پیشانی سے اپنے شوہر کے قدموں کو چھوا اور وہ چونک کر اس طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ گویا وہ کسی خواب سے چونک کر بیدار ہوا ہے۔

جب اس نے حیرت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ تو میں نے اس سے کہا۔ ''کہ میں نے دنیا کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ آئندہ میں تمہارے پاس نہیں رہ سکتی۔ اب مجھے تمہارے گھر کو خیر باد کہنا پڑے گا۔''

میرے شوہر نے سمجھا کہ وہ اب بھی خواب دیکھ رہا ہے۔ اس لئے اس نے جواب میں ایک لفظ تک نہ کہا۔

میں نے دوبارہ نہایت غمگین لہجے میں کہا کہ ''آہ میری بات سنو اور اس کو سمجھو۔ تمہیں اب دوسری شادی کرلینی چاہئے۔ میرا اب یہاں سے رخصت ہوجانا ناگزیر ہے۔''

میرا شوہر کہنے لگا۔ ''یہ کیا پاگلوں کی سی باتیں کئے جارہی ہو۔ تمہیں کس نے دنیا ترک کردینے کو کہا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''میرے گرو ٹھا کرنے!''

میرا شوہر کچھ حواس باختہ سا ہوگیا اور چلا کر بولا۔ ''گرو ٹھا کرنے کب تمہیں یہ نصیحت کی؟''

میں نے جواب دیا۔ کل صبح جب میں دریا پر سے آتی ہوئی راہ میں اس سے ملی تھی۔

میرے شوہر کی آواز کانپنے لگی اور وہ میرے چہرے پر اپنی دکھ بھری نگاہیں گاڑھ کر بولا۔ ''اس نے تمہیں ایسا حکم کیوں دیا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''مجھے تو معلوم نہیں۔ اسی سے پوچھ لو۔ اگر اس نے بتانے کی جرأت کی۔ تو اسی سے تمہیں سارا حال معلوم ہوجائے گا۔''

میرا شوہر کہنے لگا۔ ''لیکن دریا میں رہ کر بھی انسان تارک الدنیا ہوسکتا ہے۔ تمہارے لئے میرا گھر چھوڑنا ضروری نہیں کل میں اس بارے میں اپنے گرو سے بات چیت کرلوں گا۔''

میں نے کہا ''تمہارا گرو تمہاری درخواست منظور کرلے تو کرلے۔ مگر میرے دل

کو بدلنا کسی کے اختیار میں نہیں۔ میرے لئے تمہارے گھر کو خیر باد کہنا ضروری ہو گیا ہے۔ اب دنیا میرے لئے باقی نہیں رہی۔"

میرا شوہر خاموش رہا اور ہم اندھیرے میں اس وقت تک فرش پر بیٹھے رہے۔ جب تک کہ دن کی روشنی پھیل نہ گئی۔

اس کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ چلو دونوں گرو کے پاس چلیں۔

میں نے جواب میں دست بستہ اس سے کہا" کہ اب میں کبھی اس سے ملنا نہیں چاہتی۔"

میرے شوہر نے غور سے میری طرف دیکھا اور میں نے اپنی آنکھیں جھکالیں۔ اس کے بعد اس نے کچھ نہ کہا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرے دل کے حال سے پورا واقف ہو گیا ہے۔

دنیا میں صرف دو آدمیوں کو مجھ سے حقیقی محبت تھی۔ ان میں سے ایک میرا بچہ تھا۔ اور دوسرا میرا شوہر یہی محبت میرا خدا تھی۔ اس لئے یہ کسی قسم کی ناراضگی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن میرے بچے نے خود مجھے چھوڑ دیا اور اپنے شوہر کو خود میں نے چھوڑا۔ میرے لئے اب صداقت سے محبت کرنے کے سوا اور کیا باقی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے میرے قدموں کو چھوا اور رخصت ہو گئی۔

(ٹیگور)

ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور کاافسانہ "جوگن" کا ترجمہ راجہ مہدی علی خان کے قلم سے ہوا ہے۔ یہ ترجمہ ان کی کتاب "ستارۂ صبح" جو کہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز نے چھاپی ہے۔بقول ترجمہ کار اس افسانے کو اس کتاب میں پوری تحویل میں چھاپا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے یہ سمجھ سکیں کہ ترجمہ کار نے ترجمہ صحیح کیا ہے۔ بقول ترجمہ کار اس افسانے کو پڑھ کر میں نے مختلف مدوں میں اس افسانے کو تقسیم کرکے اس طرح تنقیدی مراسلہ کیا ہے۔

ا۔دوسرے زبان کے افسانہ نگار

اردوزبان میں بہت سے افسانہ نگار موجود ہے۔جن میں سے کئی افسانہ نگاروں نے بہت سی باتیں صحیح انداز میں لوگوں تک پہنچائی ہے اور لوگ پڑھ کر بہت ہی خوش ہوئے اور افسانہ نگاروں کی تعریف کرنے لگے۔اسی طرح میں نے اس کتاب میں دوسرے زبان کے افسانہ نگاروں کا بھی خیال لکھ کر یہ تحقیق کرنا چاہا ہے کہ کیا اُردو زبان میں بھی دوسرے زبان کے افسانہ نگار بہترین لکھتے ہیں اور وہ ایسی ہی دلیل افسانوں میں بتاتے ہیں جس طرح کے اردوزبان میں اردوافسانہ نگار بتاتے ہیں۔ اسی لئے میں نے مناسب سمجھا کیوں نہ بنگالی ادیب، ہندی ادیب اور انگریزی ادیب کا افسانہ اس کتاب میں چھاپ کر میں تحقیق کروں تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ

دوسرے زبانوں کے افسانہ نگار کس انداز میں اپنا افسانہ اپنی زبانوں میں تحریر کرتے ہیں۔

اسی لئے ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور کا افسانہ ''جوگن'' چن کر دلیل بیان کرتا ہوں۔

۲۔ گاؤں کی ترقی اور گاؤں کا سکون

ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں سب سے پہلے گاؤں کے بارے میں ہی کچھ تذکرہ کیا ہے۔ میرے خیال میں اسی لئے گاؤں کو ترجیح دی ہے تا کہ لوگوں میں اس بات کا احساس ہو جائے کہ شہر سے بہتر گاؤں ہے۔ اس کے بارے میں یہ بھی اطلاع فراہم کرتا ہوں کہ آزادی کے بعد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی تقریر میں بار بار یہ فرمایا تھا کہ گاؤں کی ترقی بہت ہی ضروری ہے۔

اسی طرح سے مرار جی ڈیسائی اور چودھری چرن سنگھ نے بھی اپنے اپنے دور میں یہی بات دہرائی ہے۔ میرے خیال میں ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے افسانے میں اسی لئے گاؤں کو ترجیح دی ہے تا کہ یاد رہے کہ انگریزی سامراج میں کوئی بھی ترقی نہیں ہوئی ہے۔ جب ہندوستان آزاد ہو جائیگا تو اس وقت لوگوں کو اور رہنماؤں کو گاؤں کی ترقی کے بارے میں احساس ہو جائیگا۔ ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں یہ بتایا ہے کہ میرے خیال میں کہ گاؤں میں ٹھیک طرح سے ایک ادیب اپنی لکھائی کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ کیونکہ گاؤں میں سکون ہے اور کھلی تازہ ہوا بھی۔ گاؤں میں پرندوں کا چہچہانا بہت ہی پسند آتا ہے۔ تبھی ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں یہ بات دہرائی ہے کہ ایک قلمکار جو کہ اپنی قلم سے دلائل چھاپتا رہا اور اس کے دلائل پر لوگ مخالف ہو گئے۔ جب قلم کار کو محسوس ہوا کہ لوگ اس کے قلم کے خلاف ہوئے ہیں تو قلمکار نے چاہا کہ میں کلکتہ سے دور کسی گاؤں میں رہوں تا کہ میری نفرت

لوگوں میں کم ہوجائے اور قلمی رجحان گاؤں میں ہی رکھوں گا۔ ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں یہ بات نہیں بتائی ہے کہ لوگ قلمکار کے خلاف ہوئے۔ انہوں نے کونسا ایسا مواد پڑھا جس سے کہ لوگ برخلاف ہوئے۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ ان دنوں جدوجہد آزادی ملک میں چل رہی تھی۔ ممکن ہے کہ انگریزوں کی طرف داری میں قلمکار نے کچھ بیان کیا ہوگا۔ اسی لئے لوگ قلمکار کے برخلاف ہوئے۔

۳۔ قلمکار کسی بھی زبان کا ہو

ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں اس بات کا بھی احساس دلایا ہے کہ ایک قلمکار کو اپنا قلم لوگوں کے ہی حدود میں رکھنا چاہئے جب لوگ اس کے قلم کا احترام کریں تو قلمکار کو بھی احترام مل سکتا ہے۔ یہ کہہ کر اس افسانے میں سب سے پہلے ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور یہی بتانا چاہ رہے ہیں۔

۴۔ دوفریقوں میں دل پر قابو

ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور اس افسانے میں دوفریقوں کا چال چلن بتا رہے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک قلمکار جو کہ لوگوں سے دور رہ کر گاؤں میں قیام کرتا ہے اور اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے قلم سے لوگ خلاف ہوئے اور اس مخالفت کی وجہ سے وہ گاؤں میں چپکے سے جا بیٹھتا ہے تاکہ لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم نہ ہوجائے۔ ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں یہ بتایا ہے کہ جب وہ گاؤں میں قیام کرتا ہے اور وہاں پر اس سے کوئی عورت ملتی ہے۔ تو سب سے پہلے وہ عورت اس کو پھول بھینٹ کرتی ہے۔ لیکن قلمکار کچھ نہیں بتاتا ہے نہ اس عورت کو دیکھتا ہے اسی طرح سے یہ عورت بہت بار اس سے ملتی ہے۔ مل کر کبھی پھول کبھی کھانا دیتی ہے لیکن قلمکار بڑے دل سے

نہیں دیکھتا ہے۔ نہ قلمکار اس عورت کے کسی حال کے بارے میں پوچھتا ہے۔ حتی کہ یہ عورت اس سے کہتی ہے کہ وہ ننگے پاؤں چومنا چاہتی ہے لیکن پاؤں میں جرابیں ہیں۔ لیکن قلمکار اس بات پر توجہ ہی نہیں دیتا۔ یعنی اپنا دل بالکل پاک وصاف رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ عورت بہت بار ایسی ایسی باتیں کہیں لیکن قلمکار ان باتوں کی طرف توجہ ہی نہیں دیتا۔

اس کے برعکس گروٹھاکر اس عورت کے خاوند کا دوست ہے۔ لیکن وہ قلمکار کی طرح کا اخلاق نہیں رکھتا۔

دلیل اس طرح ہے بیان کرتا ہوں۔ اس عورت کا اپنا بچہ اس دنیا سے چل بستا ہے۔ بچے کے خاطر عورت کا خاوند سوچتا ہے کہ اس کی بیوی کو اس بات کا صدمہ نہ رہے کہ ان کا بچہ گذر چکا ہے اور عورت نے بچے کا پیار کھودیا ہے۔ اسی لئے اپنی بیوی کو ان باتوں سے مبرا کرنے کے لئے وہ ایک مذہب پرست دوست کو تلقین کرتا ہے کہ اس کی بیوی کو مذہب کے بارے میں باتیں بتائے۔ تاکہ ان باتوں سے ان کو بچے کا صدمہ محسوس نہ ہو۔ مطلب گروٹھاکر ایک گرو بن کر عورت کو مذہبی نصیحت دے رہا ہے۔ مذہبی نصیحت حاصل کرنے پر اس عورت نے گروٹھاکر کو گرو تسلیم کرلیا۔

پانچ سال کے بعد برسات کے مہینے میں عورت دریا میں نہاتی ہے اور گیلے کپڑے پہن کر گھر کے لئے روانہ ہوتی ہے۔ راستے میں گروٹھاکر دیکھتا ہے۔ دیکھ کر وہ اس عورت سے کہتا ہے کہ ان گیلے کپڑوں میں اس کو بہت ہی اچھی اور خوبصورت لگ رہی ہے۔ یہ سن کر عورت شرم کے مارے اپنے خاوند کو کچھ نہیں بتاتی ہے۔ ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور اس افسانے میں یہ بتا کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کس طرح ایک مذہبی آدمی کو گراوٹ کا احساس ہوا اور اس کے برعکس ایک قلمکار کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا اور اپنے دل پر قابو رکھ کر دیکھایا کہ اپنا چال چلن درس رکھنا چاہئے۔ ڈاکٹر

رو یندر ناتھ ٹیگور یہی کہہ رہے ہیں کہ دو لوگوں کے دلوں میں کھوٹا پن کس طرح پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر چہ آج کل کی روایت کے مطابق اس افسانے کا مطالعہ کریں تو اس وقت اس قسم کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے کے ذریعہ اس بات کا احساس دلایا ہے کہ انسان کو اپنے دل پر قابو رکھنا نہایت ضروری ہے۔ خواہ وہ قلمکار ہو یا مذہبی پیروکار۔

۵۔ عورت میں قوتِ برداشت

ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں ایک غمزدہ عورت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کے اندر کتنی قوت برداشت ہے وہ یہ اپنے بچے ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھتی ہے۔ اسی طرح سے اپنے خاوند کے برے چال چلن کی وجہ سے اپنے مذہبی گرو کے بتائے ہوئے اصولوں میں ناکامیاب ہوتی ہے۔ ایک مذہبی گرو کی غلط باتیں سن کر اپنے خاوند کو کہتی ہے کہ وہ اسے گرو ٹھاکر سے دور رکھے۔ میرے خیال میں عورت اپنے بچے کو کھونے کے صدمہ کی وجہ سے اپنی زندگی سنبھال نہ سکی۔

مذہبی گرو کے چال چلن کی وجہ سے بھی عورت کو بہت صدمہ پہنچا۔ ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں اتنے صدمے برداشت کرنے پر بھی ایک عورت میں قوتِ برداشت حد درجہ پایا گیا۔ بچے کو کھونے پر بھی پاگل پن محسوس نہیں ہوا۔ بلکہ اس صدمہ کو بھی برداشت کیا۔

۶۔ موسم کا رجحان

ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں موسم کا رجحان بھی بتایا ہے کہ موسم گرما، موسم سرما اور برسات کے موسم میں کیا کیا واقعات رونما ہوتے ہیں۔ جیسے کہ ایک موسم میں دھند دیکھ کر آفتاب کی کرنیں نظر نہیں آتی ہے اور راہگیر کو دن میں اندھیرا

محسوس ہوتا ہے۔ جب اندھیرا ہوتا ہے تو چلنے پھرنے میں رکاوٹ آتی ہے۔ ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں یہ بتایا ہے کہ جب کبھی ایسا موسم ہوتا ہے تو لوگ ٹھہر کر سورج کی کرنیں نمودار ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ اس افسانے میں ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے بتایا کہ قلمکار وقت کو ضائع نہ کرنے کی وجہ سے ایک گائے کو دیکھ کر اس کی تعریف کرتا ہے۔

دوسری بات ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے لکھی کہ موسموں کے بدلاؤ سے صحت میں بھی بدلاؤ آتا ہے۔ قلمکار کو نزلہ محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ سورج کی گرمی میں کھڑے ہو کر ایک میدان میں گائے کو گھاس چرتے ہوئے دیکھتا ہے۔

۷۔ شادی کی عمر

ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں یہ نصیحت دی ہے کہ کم عمری میں شادی نہیں کرنی چاہئے۔ اس سے بہت ہی نقصان ہوسکتا ہے۔ جیسے کہ ایک عورت کو پندرہ سال کی عمر میں بچہ پیدا ہوتا ہے اور وہ خود بچّی ہوتی ہے۔ اس کا دماغی توازن بالکل ہی بچپن جیسا ہوتا ہے۔ اس افسانے میں ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے بتایا ہے کہ بچے کو کیسے موت آئی۔ کیونکہ ایک ماں بچے کو اپنا لاڈ پیار نہیں دے سکی۔ جب پندرہ سال کی عمر میں بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی ہے۔ بچے کو نہیں سنبھالتی ہے۔ نہ سنبھالنے کے وجہ سے وہ ایک بار کنویں میں بھی ڈوبتا ہے پھر خود یہی ماں بچے کو پانی سے باہر نکال کر بچاتی ہے۔ اسی طرح سے سہیلیوں کے ساتھ کھیلنے کی وجہ سے یہ عورت اپنے بچے کو دائی کے حوالے کرتی ہے۔

مطلب عورت کا نادان پن ہونے سے بچہ محفوظ نہیں رہتا۔ اسی طرح سے بہت سے واقعات ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں بتائے ہیں جن سے یہ

نصیحت ملتی ہے کہ عورت کی شادی چھوٹی عمر میں نہیں ہونی چاہئے۔ ممکن ہے کہ میرے خیال میں اس افسانے کے متاثر ہو کر ہندوستان کے ایوان بالا اور ایوان پائین میں قانون مرتب کیا گیا کہ شادی کی حد ۲۵ سال سے نیچے نہیں ہونی چاہئے۔

۸۔ گھر کے مالک کو گھر کا خیال

ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں بتایا ہے کہ جب گھر کا مالک اچھا ہوگا تو گھر کا ماحول بھی اچھا رہے گا۔ ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بچے کو کھونے پر خاوند نے اپنی بیوی کو صدمے سے باہر نکالنے کے لئے کسی مذہبی گرو کے سپرد کر دیا تاکہ وہ مذہبی باتیں سنائے۔ دوسری بات گھر کے مالک نے جب یہ سنا کہ مذہبی پیرو کار کا چال چلن اچھا نہیں ہے اور اپنی بیوی پر شکوک کو بالائے طاق رکھ کر اس مذہبی گرو سے قانونی انداز میں بھائی ہی تسلیم کیا۔ لیکن اتنا ہونے پر بھی بیوی نے اقرار نہیں کیا۔ ایک مرد میں قوتِ برداشت کتنی ہے جو کہ گھر کا مالک ہے۔ گھر میں کوئی بھی فتنہ فساد رونما ہونے نہیں دیتا۔ اتنی باتیں برداشت کر کے بھی اپنے گھر کو سنبھالتا ہے۔ میرے خیال میں اس افسانے میں ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے بہترین انداز میں نصیحتیں کی ہیں۔

۹۔ افسانے کا عنوان

ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور نے اس افسانے کا عنوان ''جوگن'' رکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ عنوان بہت ہی اچھا ہے۔ کیونکہ اس افسانے میں ایک عورت اپنے بچے سے محروم ہو جاتی ہے اور یہی عورت خود بخود اپنے خاوند سے ناطہ منسوخ کرتی ہے۔ ان دونوں وجوہاتوں سے عورت جوگن بنتی ہے۔ اسی لئے جوگن عنوان بہت ہی بہترین ہے۔

۱۰۔ اُردو ادب میں ادبی تنقید کے لحاظ سے

میرے خیال میں ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹیگور کی مندرجہ بالا باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ افسانہ اردو ادب میں ادبی تنقید کے لحاظ سے بہت ہی اچھا ثابت ہوسکتا ہے۔ اور اس افسانے سے دوسرے افسانے نگار کو بہت سی باتوں کا علم حاصل ہوسکتا ہے۔ اور اس طرح کے افسانے اردو ادب میں ادبی تنقید کے لحاظ سے بہت ہی بہترین ثابت ہوسکتے ہیں۔ اردو ادب میں بہت سے افسانہ نگار ہیں اور ہمیں دوسرے زبانوں کے افسانہ نگاروں سے بھی کچھ اطلاعات فراہم ہوسکتی ہیں۔ جو کہ ادب کے لئے بہت ہی بہترین ثابت ہوسکتے ہیں۔

ودیشی زبانوں کے افسانہ نگار

ہندوستان کے مختلف زبانوں کے افسانہ نگار

ایک ہی ترازو میں

افسانہ ”فیروزہ“

ترجمہ: راجہ مہدی علی خان　　تحریر: لارڈ ٹینی سن

عبداللہ ایک بہت بڑا زمیندار تھا۔ اپنے چھوٹے سے گاؤں کا بادشاہ وہی تھا۔ سلیم اس کا بیٹا اور فیروزہ اس کی بھتیجی تھی۔ عبداللہ کو ان دونوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ سلیم کی شادی فیروزہ سے کروں گا۔ فیروزہ کو اپنے چچا کی اس آرزو کا علم تھا۔ گویا ایک طرح سے وہ سلیم سے منسوب ہو چکی تھی۔ رفتہ رفتہ شاید اسی وجہ سے سلیم سے محبت ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ وہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے اور فیروزہ ہر وقت سلیم کے سامنے رہتی تھی۔ اس لئے وہ فیروزہ کو قدرتاً ایک معمولی شکل کی لڑکی سمجھتا تھا۔ اور اس سے شادی کرنے پر رضامند نہ تھا۔

ایک دِن عبداللہ نے اپنے بیٹے کو پیار سے اپنے پاس بلایا اور کہا ”میرے بیٹے!

اگر چہ میں نے بڑی عمر میں شادی کی تھی لیکن میری آرزو ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے پوتے کو کھیلتا ہوا دیکھوں۔ میں نے تمہاری منسوبہ منتخب کرلی ہے۔ اس کی صورت شکل بھی بہت اچھی ہے۔ گھر کا کام کاج بھی بڑے سلیقے سے کرتی ہے۔ تم سمجھ گئے ہو گے کہ میرا اشارہ فیروزہ کی طرف ہے۔ وہ میرے مرحوم بھائی کی نورِ نظر ہے۔ ایک دفعہ میری اور اس کی لڑائی ہوگئی۔ وہ مجھ سے ناراض ہوکر کسی دور دراز ملک میں چلا گیا وہیں اس نے وفات پائی صرف اس خیال سے میں نے اس کی لڑکی فیروزہ کو بڑی محبت سے پالا ہے۔ اب ماشاءاللہ تم بھی سیانے ہو چکے ہو اور وہ بھی جوان ہے۔ تم اس سے جلدی شادی کرلو۔ میں کئی سالوں سے اسی خیال میں غرق رہا ہوں اور میری دلی آرزو ہے کہ تم دونوں کو دولہا دلہن بنتے ہوئے دیکھوں۔

سلیم نے باپ کی لمبی چوڑی تقریر سن کر جواب میں صرف اتنا کہا۔ ''میں فیروزہ سے شادی نہیں کرسکتا بلکہ میں یوں کہوں گا کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ فیروزہ سے میں شادی نہیں کروں گا۔''

بوڑھے عبداللہ کو بیٹے کے اس رُوکھے جواب پر بہت غصہ آیا۔ کہنے لگا۔ ''ہیں! کیا تم فیروزہ سے شادی نہیں کرو گے؟ بڑے گستاخ ہو۔ مجھے ایسا جواب دینے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟ ہمارے وقتوں میں باپ کے الفاظ قانون کی طرح اٹل سمجھے جاتے تھے۔ اور میں بھی اپنے الفاظ کو قانون کی طرح اٹل منوا کر چھوڑوں گا۔ سلیم! دیکھو، میں تمہیں اس بات پر غور کرنے کے لئے ایک مہینہ کی مہلت دیتا ہوں۔ اگر تم میری بات مان گئے تو خیر ورنہ خدا کی قسم میرے گھر میں تمہارا ٹھکانا نہیں۔ اپنا سامان باندھ کر یہاں سے چلے جانا اور مجھے عمر بھر اپنی شکل تک نہ دکھانا۔''

سلیم مارے غصے کے پاگل ہوگیا۔ اور اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹنے لگا۔ وہ فیروزہ کی شکل پر جتنا زیادہ غور کرتا۔ اتنی ہی زیادہ وہ اسے بری معلوم ہوتی۔ اب وہ

فیروزہ سے نہایت تلخ کلامی اور درشتی سے پیش آنے لگا۔ لیکن جواب میں فیروزہ اس سے نہایت نرمی اور ملائمت سے پیش آتی۔ ایک مہینہ ختم ہونے سے پہلے سلیم باپ کا گھر چھوڑ گیا اور ایک کسان کے پاس کھیتوں میں ہل چلانے کے کام پر نوکر ہو گیا۔ اور اس نے ایک مزدور کی لڑکی عائشہ کے دل پر اپنی محبت کا سکہ بٹھا کر اس سے شادی کر لی۔

جب برات کے نقاروں کی آواز عبداللہ کے گھر میں سنائی دی۔ تو اس نے اپنی بھتیجی فیروزہ کو پاس بلا کر کہا۔ ''میری بیٹی! مجھے تم سے بڑی محبت ہے۔ لیکن اگر تم نے اس شخص سے کوئی بات کی جسے لوگ میرا بیٹا کہتے ہیں۔ یا تم نے اس عورت سے گفتگو کی جسے لوگ اس کی دلہن کہیں گے تو یاد رکھنا اس دن سے میرے گھر کے دروازے تمہارے لئے بھی بند ہو جائیں گے۔ یاد رکھو میری خواہش قانون کی طرح اٹل ہے۔''

فیروزہ بڑی فرماں بردار لڑکی تھی۔ اس نے اپنے دل پر جبر کر کے چچا کے مشورے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی سوچا کہ تھوڑے عرصے میں چچا کا غصہ اتر جائے گا اور مجھ پر سے یہ پابندی خود بخود اٹھ جائیگی۔

اسی طرح بہت عرصہ گزر گیا۔ آخر سلیم کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ خدا کی قدرت! بچہ پیدا ہوتے ہی سلیم کے برے دن آ گئے۔ اسے ایسی مالی مشکلات آ پڑیں کہ جن کا سامنا اس کے لئے بہت دشوار تھا۔ اب وہ ہر روز اپنے باپ کے دروازے کے سامنے سے گزرتا لیکن باپ اس کی مدد کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ فیروزہ گھر کے خرچ سے تھوڑے بہت جو کچھ بھی بچا سکتی۔ چوری چوری کسی نہ کسی طریقے سے سلیم کے گھر پہنچا دیتی۔ خود ان لوگوں کو بھی علم نہ تھا کہ ہمارا محسن کون ہے۔ آخر ایک دن بہت ہی منحوس آیا۔ سلیم کو بخار چڑھا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ ان دنوں فصلیں کٹ رہی تھیں۔

فیروزہ عائشہ کے گھر گئی۔ عائشہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ اپنے بیٹے کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ فیروزہ نے پاس آ کر کہا۔ ''میں اب تک اپنے چچا

کے حکم بجالاتی رہی ہوں ۔ میں گنہگار ہوں کیونکہ پہلے پہل میری ہی وجہ سے سلیم مصیبت میں گرفتار ہوا۔ لیکن عائشہ! اس ہستی کی خاطر جواب دوسری دنیا کو سدھار چکی ہے۔ اوراس عورت کی خاطر جسے اس نے اپنی دلہن منتخب کیا تھا۔ اوراس یتیم بچے کی خاطر جسے وہ چھوڑ گیا ہے۔ میں یہاں آئی ہوں تم جانتی ہو پچھلے چند سالوں میں فصل بہت بری ہوتی رہی ہے۔ اوراس سال خلافِ توقع فصل کی حالت بری نہیں۔ اپنا بچہ مجھے دے دو۔ میں اسے اس وقت اپنے چچا کی نظروں کے سامنے لے جاؤں گی۔ جب وہ اپنے غلے کے کھیتوں میں خوش خوش پھر رہا ہوگا۔ اس خوشی کی حالت میں شاید اسے اپنے پوتے کی صورت دیکھ کر رحم آجائے اور وہ اسے اپنے پاس رکھنا منظور کرے۔

فیروزہ بچہ لے کر چل دی اور غلے کے کھیتوں میں بچے کو گود میں لئے ایک ٹیلے پر بیٹھ گئی۔ اس ٹیلے پر کوئی فصل نہیں بوئی گئی تھی۔ البتہ سیب کے خوشنما پھولوں نے اسے رشک ارم بنا رکھا تھا۔ دُور دُور سے کسان آکر ان کھیتوں کے قریب سے گزرتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے فیروزہ کو بچے سمیت وہاں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ لیکن ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اس کے چچا کو جا کر بتائیں۔ کہ اس کی بھتیجی سلیم کے بچے کو گود میں لئے اس کی آمد کی منتظر ہے۔ فیروزہ وہاں سے اٹھ کر چچا کے پاس جانے کا ارادہ کرتی۔ لیکن ہمت اسے جواب دے دیتی۔ فصل کاٹنے والے مزدور فصل کاٹ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ سورج غروب ہوگیا اور ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ لیکن فیروزہ اب بھی وہیں بیٹھی تھی۔

صبح ہوتے ہی وہ بستر سے اٹھ بیٹھی۔ اس نے دوبارہ بچے کو گود میں لیا اور اس ٹیلے پر آبیٹھی۔ اس نے اردگرد کے تمام پھول چن کر بچے کی ٹوپی میں لگا دیئے۔ تا کہ وہ اپنے دادا کو زیادہ من موہنا نظر آئے۔

جب کسان کھیتوں کی طرف آنے لگے تو کچھ کسانوں کے ساتھ عبداللہ بھی وہاں

آنکلا۔اس نے فیروزہ کو بیٹھے دیکھ کر اپنے ملازموں کوتو وہیں چھوڑا اور فیروزہ کے پاس آ کر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ ''تم تمام شب کہاں رہیں؟ یہ کس کا بچہ ہے؟ اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

فیروزہ نے اپنی نگاہیں نیچی کرلیں اور نہایت ملائمت سے بولی۔ ''یہ سلیم کا بیٹا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس کا چچا پکار اٹھا۔ ''بتاؤ! میں نے تمہیں منع کیا تھا یا نہیں کہ ایسی حرکت نہ کرنا؟''

فیروزہ بولی۔ ''میرے ساتھ جیسا سلوک آپ چاہیں کریں۔ لیکن اس بچے کو اس ہستی کی خاطر جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہمیں چھوڑ گئی ہے۔ اپنے پاس رکھ کر اس پر نگاہ لطف کیجئے۔

عبداللہ غصے سے گرج کر کہنے لگا۔ ''میں جانتا ہوں تم نے اور اس عورت نے جان کر یہ چال چلی ہے۔ دیکھو خدا کی شان! تم اور مجھے اپنے فرائض انجام دینے کا سبق دو! اچھا میں تم سے زیادہ سختی کا سلوک نہیں کروں گا۔ بچہ تو مجھے دے دو۔ لیکن خود میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ آئندہ مجھے اپنی شکل تک نہ دکھانا۔''

یہ کہہ کر اس نے فیروزہ کی گود سے بچہ لے لیا۔ بچے رونے چلانے لگا اور اس نے عبداللہ کی گود سے نکلنے کے لئے بہت سے ہاتھ پاؤں بھی مارے یہاں تک کہ اس کی ٹوپی میں گندھے ہوئے پھول فیروزہ کے قدموں میں آ گرے۔

عبداللہ کھیتوں میں بہت دور نکل چکا تھا۔لڑکے کی چیخوں کی آواز بتدریج کم ہوتی ہوئی آواز فیروزہ کو سنائی دے رہی تھی۔ فیروزہ کا سر جھک گیا تھا۔اس وقت اس کے تصور میں وہ زمانہ تھا۔ جب وہ پہلے پہل اس گھر میں آئی تھی۔ گزرے ہوئے تمام واقعات کا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھرنے لگا وہ ایک گھنے کھیت میں مزدوروں کی

نظروں سے چھپ کر چہرہ ہاتھوں میں چھپائے زار وقطار رونے لگی۔ کھیت کاٹنے والے مزدور کھیت کاٹ چکے تھے سورج ڈوب گیا اور ہر سمت تاریکی چھا گئی۔

اب فیروزہ نے عائشہ کے گھر کی راہ لی۔ وہ اس کے مکان کے بڑے دروازے پر آ کر کھڑی ہوگئی۔ مصیبت زدہ عائشہ نے جب دیکھا کہ بچہ اس کی گود میں نہیں ہے تو اس کے منہ سے دعائیہ الفاظ فوارے کی طرح پھوٹ نکلے کہنے لگا۔ "اے خدا! میں کن الفاظ میں تیرا شکرادا کروں کہ تو نے بیوگی میں مجھ پر عنایت کی نظر کی۔"

فیروزہ بولی۔ "چچا جان بچے کو گود میں لے گئے ہیں۔ لیکن عائشہ! اب مجھے اپنے گھر میں رہنے اور یہیں کام کرنے کی اجازت دو۔ چچا جان اب عمر بھر میرا منہ نہیں دیکھیں گے۔"

عائشہ نے جواب دیا۔ "نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ تم میری خاطر اتنی تکلیف کیوں برداشت کرو۔ اب میں اپنے بچے کو چچا کے حوالے نہ کروں گی۔ وہ اسے بھی اپنی طرح دوسروں پر سختی کرنا اور ماں سے نفرت کرنا سکھا دیں گے۔ آؤ ہم دونوں ان کے گھر چلیں۔ میں اپنا بچہ واپس لے آؤں گی۔ اور ان سے التجا کروں گی کہ تم کو واپس بلا لیں۔ اگر انہوں نے تم کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت نہ دی۔ تو پھر میں اور تم اس گھر میں اکٹھی رہیں گی۔ اور اس وقت تک بچے کی پرورش کے لئے کوئی کام کرتی رہیں گی۔ جب تک کہ وہ بڑا ہو کر ہماری مدد کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔

دونوں نوخیز عورتوں نے ایک دوسری کا منہ چوم لیا۔ اور پھر عبداللہ کے مکان کی طرف چل پڑیں۔ جب وہاں پہنچیں تو دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھلا تھا۔ دونوں نے چوری چوری اندر جھانک کر دیکھا کہ بچہ اپنے دادا کی گود میں بیٹھا ہے۔ دادا نے اسے سینے سے لگا رکھا ہے اور اس کے گالوں پر ہلکے ہلکے چپت لگا رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کی محبت اس دادا کی آنکھوں میں سمٹ کر آسمائی ہے۔ اور اسے وہ اپنے پوتے کے پھول سے چہرے پر نثار کر رہا ہے۔ بچے نے دونوں بازو اس مہر کی طرف

پھیلا رکھے تھے۔ جو اس کی گھڑی کی زنجیر سے بندھی آگ کے سامنے چمک چمک کر چکا چوند پیدا کر رہی تھی۔

دونوں اب اندر داخل ہوئیں۔ جب لڑکے نے ماں کو دیکھا۔ تو وہ اس کے پاس جانے کے لئے رونے لگا۔ عبداللہ نے اسے اپنی گود سے نیچے اتار دیا۔ عائشہ بولی۔ ''ابا! بشرطیکہ آپ مجھے آبا کہنے کی اجازت دیں۔ میں آپ کے پاس اپنے لئے۔ اس بچے کے باپ کے لئے یا اس بچے کے لئے بھیک مانگنے نہیں آئی ہوں۔ بلکہ میں صرف فیروزہ کے لئے آپ سے ایک التجا کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں پہنچی ہوں۔ اسے اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دیجئے۔ اسے آپ سے بے حد محبت ہے۔ ابا! جب اس بچے کے باپ نے وفات پائی تو اسے اپنے کسی عزیز سے بھی شکایت نہ تھی۔ اس نے مجھ سے بھی یہ الفاظ کہے کہ ''میں تم سے شادی کر کے کبھی نہیں پچھتایا۔'' کیونکہ میں ایک صابر وشاکر، بیوی ثابت ہوئی ہوں۔ لیکن ابا! مرتے وقت اس نے ایک اور بات بھی کہی وہ یہ کہ ''مجھے اپنے باپ کی حکم عدولی کرنے کا بڑا افسوس ہے۔ خدا ان پر اپنی برکتیں نازل کرے۔ خدا کرے انہیں کبھی معلوم نہ ہو کہ میں کن کن مصیبتوں میں مبتلا رہا ہوں۔'' یہ الفاظ کہہ کر اس نے کروٹ ہی لی تھی کہ اس کی روح دوسری دنیا کو پرواز کر گئی۔ ابا! اب مجھے میرا بیٹا واپس دے دیجئے۔ آپ اسے بھی دوسروں پر سختی کرنا سکھا دیں گے اور وہ اپنے باپ کی یاد دل سے بھلا دے گا۔ فیروزہ کو اپنے پاس رکھ لیجئے اور ہمیں اپنی پہلی حالت پر چھوڑ دیجئے۔''

عائشہ نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ فیروزہ نے اپنا چہرہ اس کی اوٹ میں چھپا لیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ یکا یک بوڑھا عبداللہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''یہ سب قصور میرا ہے۔ یقیناً سب میرا قصور ہے۔ میں اپنے بیٹے کا قاتل ہوں۔ میں نے اپنے بچے کو مار ڈالا۔ لیکن مجھے اس سے بے حد محبت تھی۔ میرے پیارے بیٹے!

خدا مجھے معاف کرے۔ سب میرا قصور ہے۔ میرے بچو! آؤ اب تم میرے سینے سے لگ جاؤ۔"

فیروزہ اور عائشہ بوڑھے عبداللہ کے پاس آ کر کھڑی ہوگئیں۔ انہوں نے متعدد بار فرطِ عقیدت سے اپنے معمر بزرگ کے ہاتھ چومے۔ انتہائی پشیمانی سے بوڑھے کی جان ہی پر آ بنی تھی۔ بیٹے کی محبت اس کے دل میں ہزار گنا زیادہ ہوگئی تھی۔ اتنی کہ اس کے دل میں اس کی جگہ بھی نہ تھی مسلسل تین گھنٹے تک وہ اپنے پوتے پر جھک پر کہ اپنے نوجوان بیٹے کی یاد میں زار وقطار روتا رہا۔ اب یہ چاروں اسی مکان میں اکٹھے رہنے لگے۔ چند سال بعد عائشہ سلیم کی موت کا غم بھول گئی اور اس نے دوسری شادی بھی کر لی۔ لیکن فیروزہ نے عمر بھر شادی کا نام نہ لیا۔

(لارڈ ٹینی سن)

لارڈ ٹینی سن کا افسانہ "فیروزہ" جس کا ترجمہ راجہ مہدی علی خان کے قلم سے ہوا ہے۔ یہ ترجمہ ان کے کتاب "ستارۂ صبح" جو کہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز نے چھاپی ہے۔ بقول مترجم اس افسانے کو اس کتاب میں پوری تحویل میں چھاپا ہے۔ تاکہ پڑھنے والے یہ سمجھ سکیں کہ مترجم نے ترجمہ صحیح کیا ہے۔ بقول مترجم اس افسانے کو پڑھ کر میں نے مختلف مدوں میں اس افسانے کو تقسیم کر کے تنقیدی مراسلہ بیان کیا ہے۔

باہمی ادبی برادری

آج تک میں نے اس کتاب میں بہت سے افسانہ نگاروں کے بارے میں اپنی رائے بیان کی لیکن افسانہ نگاروں میں زیادہ تر ملکی افسانہ نگار ہی پائے گئے۔ اب میں

نے مناسب سمجھا کہ کیوں نہ میں دوسرے انداز کے افسانوں کے بارے میں اظہار بیان کروں جو غیر ملکی افسانہ نگاروں نے لکھے ہیں۔ مطلب ودیشی ملکوں کے افسانہ نگاروں کے بارے میں اپنی تنقیدی رائے بیان کروں۔ یہ روایت میں نے اسی لئے مناسب سمجھی تا کہ ہمیں مختلف ملکوں کے ادیبوں کے بارے میں انکی ادبی خدمات کا علم ہو سکے۔ حتیٰ کہ بہت سی زبانوں میں افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے ہیں جن میں سے روسی زبان میں، امریکی زبان میں اور جاپانی زبان میں ہیں۔ مطلب ہر ایک زبان میں افسانہ نگار اپنے اپنے افسانے بیان کرتے ہیں۔ لیکن میں نے مناسب سمجھا کیوں نہ میں انگریزی زبان کے مشہور و معروف نثر نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار کے افسانے کو اس کتاب میں شامل کروں۔ اس افسانے کا ترجمہ راجہ مہدی علی خان کی قلم سے ہوا ہے۔ انہوں نے ہی اس افسانہ کے لحاظ سے اس کا عنوان ''فیروزہ'' تجویز کیا۔ جب پڑھنے والے افسانے کو اچھی طرح سے پڑھیں گے تو انہیں خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ ودیشی افسانہ نگار کس انداز کے افسانہ لکھتے ہیں۔

خیر میں نے ادبی باہمی برادری کے لئے اس افسانے کو اس کتاب میں شامل کرنے کے لئے مناسب سمجھا۔ اور اس کا تنقیدی جائزہ مندرجہ ذیل مدوں میں بیان کرتا ہوں۔

ہندوستانی طرز کے افسانہ نگار

ہمارے ملک ہندوستان میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں ۔ ان زبانوں میں مختلف ادیب پائے جاتے ہیں۔ان ادیبوں میں بہت سے شاعر، افسانہ نگار، تنقید نگار اور ڈرامہ نگار ہیں۔یعنی مذکورہ ادیب مختلف قسم کے ادبی کارنامے اپنی زبانوں میں بیان کرتے ہیں۔اگر چہ ہم اردو زبان کے بارے میں ذکر کریں تو ہم یہ معلوم ہوگا کہ اردو زبان میں ایسے افسانہ نگار موجود ہیں جن کی تحریر اور اسلوب بیان سے پڑھنے والے بہت ہی متاثر ہوئے ہیں۔اسی طرح اگر ہم دوسرے مختلف علاقائی زبانوں کے بارے میں بحث ومباحثہ کریں تو ہم یہی کہیں گے کہ ہمارے ملک میں افسانہ نگار بہت ہی بلند پائے کے قلمکار ہیں۔بہ نسبت غیر ملکی فسانہ نگاروں کے۔

ماحول قلمکار کا

جب ہم تنقید کرتے ہیں تو ادیب کی تحریر کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔خواہ وہ شاعر ہو، افسانہ نگار ہو یا ڈرامہ نگار ہو۔اس کا لکھا ہوا قلمی نسخہ پڑھنے کے بعد ہم تحقیق کرتے ہیں کہ ادیب کا ماحول کس طرح کا ہے۔مطلب ادیب کہاں رہتا ہے، کہاں سے آیا

ہے، گھر کے حالات کیسے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ تحقیق کر کے میں ادیب کے بارے میں ادبی تنقید کرتا ہوں۔ بقول مترجم ادیب ودیشی ملک کا رہنے والا ہے۔ میں نے سوچا اس لحاظ سے یہ ادیب بہت ہی بلند پائے کا افسانہ نگار ہوگا۔ لیکن جب میں نے ادیب کا ادبی فن پارہ پڑھا، پڑھ کر محسوس ہوا کہ ہمارے ملک کے مختلف زبانوں کے اور اردو زبان کے افسانہ نگار بہت ہی بلند پائے کے ادیب ہیں۔ مطلب ہمارے ملک کے افسانہ نگاروں کا طرز بیان نہایت ہی عمدہ ہے۔

گھریلوں ماحول

میں اس افسانے میں یہ پڑھتا ہوں کہ لارڈ ٹینی سن نے افسانے کی ابتداء ہی میں بیان کیا ہے کہ عبداللہ نامی ایک کردار بہت بڑا زمین دار تھا اور اس کو اپنے گاؤں میں بہت ہی احترام کے نگاہوں سے لوگ دیکھتے تھے۔ اسی اثناء میں عبداللہ کا بھائی اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔ بقول مترجم عبداللہ کے اپنے بھائی کے ساتھ اچھے تعلقات نہیں تھے۔ لیکن اس کی اکلوتی لڑکی فیروزہ گھر میں اکیلی نہیں بیٹھ سکتی۔ انسانیت اور خونی رشتہ کے ناطے عبداللہ نے اسے اپنے گھر میں آسرا دیا اور اس لڑکی کی پرورش کی۔ خود عبداللہ کا ایک لڑکا سلیم تھا۔ اگر چہ ہم گھریلو ماحول کا جائزہ ہیں تو اس انداز کا ماحول ہندوستانی ماحول میں ہی پایا جاتا ہے۔ اور یہ دیکھ کر ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ ودیشی گھریلوں ماحول اور اپنے ملکی گھریلوں ماحول میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

لالچ کا ٹھیلہ

میں نے جب اس افسانے میں عبداللہ کے کارنامے پڑھے تو میں نے سوچا کہ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ایسے کردار کو اسی لئے ذکر کیا ہے تاکہ پڑھنے والے

کو یہ محسوس ہو جائے کہ ایک بھائی کس قسم کا لالچ رکھ کر یہ سوچ رہا ہے کہ جو بھائی اس دُنیا سے رخصت ہو گیا ہے اس کی دولت لوٹ لی جائے۔ اس انداز کے بیانات ہمارے اردو ادب میں افسانہ نگاروں نے پہلے سے ہی لکھے ہیں۔ میں نے یہ تحقیق کی کہ ایسے قسم کا لالچ ودیشی خاندانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ مطلب ودیشی گھریلوں ماحول میں بھی ایسے قسم کا لالچ لوگ رکھتے ہیں۔ اسی لئے ایک ہی ترازو میں افسانے کو تسلیم کیا۔

زبردستی

میں نے اس افسانے میں دوسرا ایک اہم واقعہ یہ پڑھا کہ بقول مترجم افسانہ نگار نے یہ بات کہی کہ عبداللہ اپنے لڑکے کی شادی فیروزہ کے ساتھ انجام دینا چاہتا تھا۔ اگر چہ لڑکے کو اس رشتے کے ساتھ نفرت تھی پھر بھی عبداللہ دباؤ ڈال کر بچے کو مجبور کرتا رہا۔ جس سے باپ اور بیٹے میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ اور اس وجہ سے بیٹا باپ سے الگ رہنے لگا۔ ایسے واقعات اردو زبان کے افسانہ نگاروں نے بھی لکھے ہیں۔ گویا یہ افسانہ ایک ہی ترازو میں ہے۔ فرق یہ ہے کہ تحقیق کرنا ہے کہ ودیشی ملکوں میں گھریلوں فسادات اس انداز کے ہوتے ہیں یا نہیں جیسے کہ ہمارے ملک میں مذکورہ وجہ سے گھریلوں فسادات رونما ہوتے ہیں۔

عبداللہ کی جدائی

اس افسانے میں بقول مترجم لارڈ ٹینی سن نے یہ بیان کیا ہے کہ عبداللہ اپنے بیٹے سلیم سے جدا تو ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنے بیٹے کو اس بات پر دباؤ ڈالتا ہے کہ وہ فیروزہ کے ساتھ شادی کرے۔ ایک مہینے کی مہلت دینے کے بعد بھی سلیم اس بات کا اقرار نہیں کرتا اور اپنے باپ کا حکم نا منظور کر دیتا ہے عبداللہ اپنے بیٹے سلیم سے جدا ہو کر اپنی ز

بسر کرتا ہے۔ اگر عبداللہ نے فیروزہ کے رشتہ کو اس طریقے سے نہ انجام دیا ہوتا تو عبداللہ اپنی زندگی بہت ہی بہترین طریقے سے بسر کرتا۔ خیر میرے خیال میں افسانہ نگار نے اس طرح کی بیان بازی سے اپنی کہانی کو پائے تکمیل تک پہنچایا ہے۔ ورنہ افسانہ میں روح پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ خیر ودیشی ملکوں اور ہمارے ملک میں گھریلوں حالات میں ایسے قسم کا ہیر پھیر ہوسکتا ہے۔ اسی لئے میں اس بات سے مکمل اقرار کرتا ہوں کہ یہ افسانہ ہندوستانی اور ودیشی طرز کے لحاظ سے ایک ہی ترازو میں ہے۔

خودرای

اس افسانہ میں میں نے یہ پایا کہ افسانہ نگار نے ایک اہم بات کی طرف توجہ مرکوز کی ہے۔ (بقول ترجمہ کار) کہ ایک آدمی خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا اپنی خودداری سے کبھی باہر نہیں آتا۔ جیسا کہ سلیم نے ایک مہینے تک اپنے آپ کو غربت کی حالت میں رہنا پسند کیا لیکن فیروزہ کے ساتھ رشتہ کرنا قبول نہیں کیا۔ سلیم اپنے والد کا کاروبار چھوڑ کر ایک زمیندار کے پاس کام کرتا ہے۔ اور اس دوران بیمار ہوجاتا ہے۔ بیماری کی حالت میں بھی اپنے باپ عبداللہ کے پاس کبھی نہیں جاتا۔ دوسری بات اسی غربت میں اپنی شادی خود رچاتا ہے۔ عائشہ نامی لڑکی کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کرتا ہے۔ لیکن فیروزہ اپنے بھائی سے جدائی برداشت نہیں کرتی۔ وہ چوری چھپے اس کی مدد کرتی رہتی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ پڑھنے والے میری اس رائے کو تسلیم کریں گے کہ ودیشی ملکوں کے افسانہ نگاروں اور ہند کے افسانہ نگاروں میں کوئی فرق نہیں۔ مطلب ایسے واقعات سبھی ملکوں میں ہوتے رہتے ہیں اور اس بات کو تسلیم کرنا چاہئے کہ ودیشی افسانہ، علاقائی افسانہ اور قومی زبان کا افسانہ ایک ہی ترازو میں ہیں۔

کردار

جب ہم مختلف اقسام کے ملکی اور غیر ملکی افسانہ پڑھتے ہیں تو ان افسانوں کے کردار کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ایک ہی طرح کے کردار مختلف قسم کے کام انجام دے رہے ہیں۔ لیکن یہ بات میری تسلیم کرنی چاہیئے کہ افسانہ ہی ترازو میں ہے۔

مرنے کے بعد پیار کا دلاسہ

ہم اس افسانے میں یہ پڑھتے ہیں کہ جب عائشہ کا خاوند سلیم کافی بیماری کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو فیروزہ اور عائشہ اپنے تعلقات قریب لاتی ہیں۔ عائشہ کے اکلوتے لڑکے کو فیروزہ عبداللہ کے پاس لے جاتی ہے اور اس لڑکے کو عبداللہ کی گود میں بیٹھا کر پیار اور دلاسہ دلانا چاہتی ہے۔ پہلے عبداللہ تحقیق کرتا ہے کہ یہ بچہ کون ہے۔ فیروزہ اسے سبھی حالات کے بارے میں واقف کراتی اور عبداللہ اس بچے کو پہلے گود میں لینے سے انکار کرتا ہے۔ پھر اس بچے کے بغیر ہی نہیں رہتا۔ رو رو کر اپنے لڑکے سلیم کو یاد کرتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ کافی بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کیوں نہ اسی بچے کی پرورش کروں تاکہ اپنے پوتے کے نام یہ جائید کر دوں۔ لیکن عائشہ عبداللہ سے اس بچے کو گود سے واپس لینا چاہتی تھی مگر عبداللہ اس بچے کو گود سے واپس نہیں دیتا۔ حالات ایسے رونما ہوتے ہیں کہ بوڑھا عبداللہ اپنی بھتیجی فیروزہ کو کہتا ہے کہ اب سلیم کی بیوی عائشہ اور بچہ اِدھر ہی قیام کریں گے۔ یہ سب زمین جائیداد ان کا ہی ہے۔ یہ سنکر عائشہ گھر میں رک جاتی ہے۔ اس کا مطلب اگر عبداللہ نے پہلے ہی سلیم کی شادی عائشہ سے کرا دی ہوتی تو ایسے واقعات رونما نہیں ہوتے۔ مانتے ہیں کہ پوتے کو پیار کیا لیکن بچے نے نہیں دیکھا۔ لڑکے کو ناخلق اولاد کہہ کے گھر سے نکال دیا۔ اگر چہ سلیم اپنی زندگانی میں ہی یہ حالات دیکھتا تو گھر کو خوشحال دیکھتے۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک نصیحت

ہے کہ ایک آدمی جب اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کے بعد ان کو پیار کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ میں اس بات کا پورا احساس دلاتا ہوں کہ ہمارے ملک میں بھی اور ودیشی ملکوں میں بھی گھریلوں حالات ایسے ہی رونما ہوتے ہیں۔ اسی لئے کیوں نہ ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ افسانہ نگار ایک ہی ترازو میں ہے۔

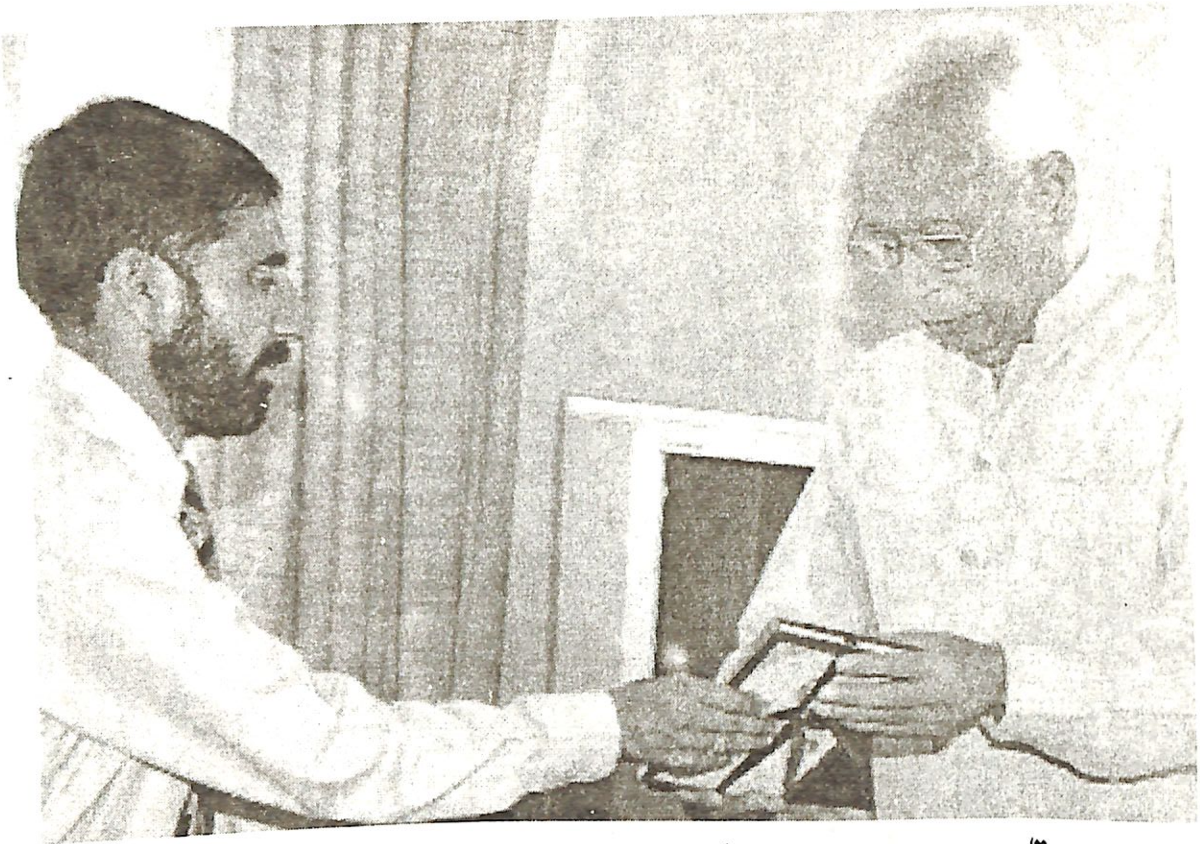
لالچ کا رُخ نہیں

میں نے افسانے میں افسانہ نگار کا کردار ''فیروزہ'' پڑھا۔ جس کے بارے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ افسانہ نگار نے اس کے متعلق صرف یہ بات لکھی کہ عبداللہ اس کی شادی سلیم کے ساتھ کرانا چاہتا تھا۔ لیکن اس رشتے کو اس کے ہی لڑکے نے منسوخ کیا۔ جس کے بناء پر گھر میں فساد ابھرنے لگا۔ لیکن عبداللہ کا کردار افسانہ نگار نے اس طرز میں نہیں بتایا کہ اس نے بھتیجی کی شادی کے لئے کوئی دوسرا رشتہ نہیں ڈھونڈا تا کہ وہ بھی اپنی رضامندی کا اظہار کرتی۔ افسانہ نگار نے اس بات سے صاف انکار کیا کہ عبداللہ کبھی فیروزہ کی رضامندی کے خلاف سوچتا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے بھتیجی کی جائیداد و جاگیر اپنی تحویل میں لینا چاہتا تھا اور اسی وجہ سے وہ سلیم کے ساتھ رشتہ جوڑنا چاہتا تھا۔ اگرچہ عبداللہ نے اس قسم کا رجحان دکھایا لیکن فیروزہ نے ہی اپنے دل و دماغ میں اسکا خیال نہیں رکھا۔ مطلب وہ صاف و پاک لڑکی تھی۔ وہ صاف دل سے عبداللہ کے رشتے کو قریب لائی۔ جیسے کہ عائشہ کے رشتہ کو بحال کر کے اس گھر میں خوشحالی لائی۔ میں اب دعویٰ سے کہتا ہوں کہ افسانہ نگار نے فیروزہ کے کردار کو ناقص قرار دے کر نچوڑ دیا ہے۔ اور محض اس وجہ سے کہ فیروزہ شادی نہیں کرتی۔ اگرچہ عبداللہ نے فیروزہ کے بارے میں اس قسم کا رجحان پیدا کیا ہوتا تو فیروزہ ضرور شادی کرتی۔ میرے خیال میں اس قسم کے واقعات ہمارے ملک اور ودیشی ملکوں میں رونما

ہوتے ہیں اسی لئے میں پورے دعویٰ سے کہتا ہوں کہ یہ افسانہ ایک ترازو میں ہے۔

عنوان

میرے خیال میں افسانہ نگار نے بہت ہی بہترین عنوان چنا ہے کیونکہ اس افسانے کا آخری مرحلہ سنگین حالت میں محسوس کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے عوان بہت ہی بہترین لکھا ہے ''فیروزہ'' کیونکہ مسئلہ اسی طرح برقرار رہنے سے ہر ایک یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ گھر عبداللہ کا ہے لیکن اس گھر میں ایک لڑکی شادی کے بغیر ہے۔ اب پوچھنے والے پوچھیں گے کہ لڑکی کا نام کیا ہے۔ اور کہیں گے ''فیروزہ''۔ اسی لئے بقول مترجم اس افسانے کا عنوان ''فیروزہ'' بہت ہی بہترین ہے۔ اس قسم کا ماحول ہندوستانی رہن سہن میں ہی نہیں بلکہ و دیشی رہن سہن میں بھی ہے۔ اسی لئے اس بات کی طرف توجہ مرکوز کرتا ہوں کہ افسانہ ایک ہی ترازو میں ہے۔



ساتویں کتاب ''قلمی چہل پہل'' ریاست جموں وکشمیر کے گورنر جناب این این ووہرا صاحب رسم اجراء کرتے ہوئے۔